www.urducouncil.nic.in
قیمت: -/10 ₹

آدمی آبادی کے جذبات واحساسات کا ترجمان

ماہنامہ خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

جون 2019

ثنا نیاز: اردو میڈیم ٹاپر

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

دل چسپ کہانیاں
معلوماتی مضامین
ہنسنے ہنسانے کی باتیں

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
قسط وار ناول

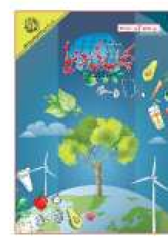

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ سیاحتی مقامات

اردو فیس بک ◆ دماغی ورزش

ننھے فنکار ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

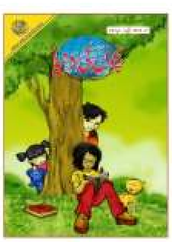

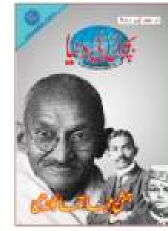

سب سے زیاہ چھپنے والا بچوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ:10 روپے   سالانہ:100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون:011-26109746، فیکس:011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in
شاخ: 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلیکس بلاک نمبر 1-5، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 040 - 24415194

اردو میں آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان
ماہنامہ
خواتین دنیا
Mahnama Khawateen Duniya Monthly, New Delhi

جلد: 3 شمارہ: 6 جون 2019

مدیر اعلیٰ : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد
مدیر منتظم : ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی
نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالحی
مشیر : ڈاکٹر مسرت

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند
مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا فیز-II، نئی دہلی۔ 110020
مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل
قیمت -/10 روپے، سالانہ -/100 روپے
صفحات: Total Pages 64

■ قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
● ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا
جسولہ، نئی دہلی-110025، فون: 49539000
نگارشات ارسال کرنے کے لیے
ای میل: kduniya@ncpul.in
editor@ncpul.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی۔ 110066
فون: 26109746 فیکس: 26108159
ای میل: sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com
شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1، چھتہ گئی، حیدرآباد-500002
فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

اداریہ	مشعل	مدیر	4
روبرو	قمر جمالی	ڈاکٹر نشاں زیدی	5
شخصیت	ش بانو ادیب کی افسانہ نگاری	محمد دانش غنی	11
پرواز کے نئے آسمان	انگریزی کے ساتھ ساتھ ہمیں اردو زبان کو بھی اپنانا ہوگا: ثنا نیاز	ڈاکٹر مسرت	14
نکہت سخن	شاعرات کے منتخب اشعار		16
جہان نسواں	ریڈیو ڈرامہ: ایک تعارف	قمر جمالی	17
	رضیہ سجاد ظہیر کے ناول 'اللہ میگھ دے' کی تہذیبی وعصری معنویت	ڈاکٹر مسرت جہاں	22
	اردو افسانے کا تانیثی تناظر	ڈاکٹر غضنفر اقبال	28
	جدید اردو افسانہ اور خواتین افسانہ نگار	کنیز فاطمہ	31
کہانیاں	وہ تیرہ دن	ڈاکٹر جہاں آرا سلیم	36
	جب صبح ہوئی	تحسین کاظمی	39
	باس	ڈاکٹر شہناز یوسف	44
	دھندا	ڈاکٹر فرحت نادر رضوی	47
حسن سخن	زینت دہلوی، دویا جین		50
باورچی خانہ	لذیذ پکوان		52
صحت	نظام ہضم	حسین فاروقی	54
آرائش وزیبائش	عرق گلاب کی جادوئی خصوصیات		57
تاثرات	نگر نگر سے		59
خواتین خبرنامہ			61

مشعل

ہرانسان میں گوناگوں صلاحیتیں موجود ہوتی ہیں۔ ہم اپنے آپ کو صلاحیت کی بنیاد پر کس طرح سے پیش کر پاتے ہیں یہ ہمارے اوپر منحصر ہوتا ہے۔ یہ صلاحیتیں ہی ہوتی ہیں جو ایک انسان کو دوسرے انسان سے ممیز کرتی ہیں۔ صلاحیت کی بنیاد پر ہی انسانوں کا موازنہ کیا جاتا ہے۔ کچھ صلاحیتیں پیدائشی ہوتی ہیں لیکن کچھ صلاحیتیں گردوپیش کے ماحول سے ابھر کر سامنے آتی ہیں۔ ہمارے ملک کے بچوں میں بہت سی صلاحیتیں موجود ہیں۔ لیکن ان میں سے بہت سے بچوں کے پاس وسائل کی کمی ہے جس کی وجہ سے ان کی صلاحیتیں ابھر نہیں پاتیں۔ کچھ علاقوں میں ایسے مراکز قائم ہیں جو ان بچوں کی تخلیقی ذہانتوں اور صلاحیتوں کو ایک پلیٹ فارم مہیا کرتے ہیں۔ لیکن ان اداروں کے ذرائع محدود ہیں۔ محدود ذرائع ہونے کے سبب ان کی تمام صلاحیتیں اجاگر نہیں ہو پاتیں۔ بعض علاقوں میں ایسے ذہین بچے موجود ہیں جو اپنی ذہانت کی بنیاد پر اعلیٰ اور قابل فخر کارنامے انجام دے رہے ہیں۔ ان بچوں کی صلاحیتوں کے نکھارنے میں کہیں نہ کہیں ان کے والدین کا بھی اہم رول ہوتا ہے۔ وسائل کی کمی اور مالی دشواریوں سے دوچار بچوں کے لاشعور میں بھی یہ بات پوشیدہ ہوتی ہے کہ ان کو اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر اپنے فن کا مظاہرہ کرنا ہے۔ چنانچہ وہ اپنے والدین پر منحصر ہونے کے بجائے خود اپنے اندر ایسی مہارتیں پیدا کرتے ہیں جو مستقبل میں ان کے بہت کام آتی ہیں۔

حال ہی میں سی بی ایس ای بورڈ کے نتائج کا اعلان ہوا۔ ہر بار کی طرح اس بار بھی لڑکیوں کا فیصد لڑکوں کی بہ نسبت زیادہ رہا۔ ثنا نیاز بھی ایسی ہی باہمت اور بلند حوصلے والی لڑکی ہے جس نے ستانوے فیصد نمبر حاصل کر کے ہم سب کو چونکا دیا۔ خوش آئند بات ہمارے لیے یہ بھی ہے کہ ثنا کا میڈیم اردو تھا۔ ثنا نیاز نے اپنی نمایاں کارکردگی سے یہ ثابت کر دیا کہ حوصلے اگر بلند ہوں تو بڑے سے بڑا معرکہ سر کیا جا سکتا ہے۔ ثنا کی اس کامیابی کے پیچھے یقیناً ان کے والدین کا اہم رول ہے۔ اسی طرح ہمیں اپنے بچوں کے اندر تخلیقی صلاحیت پیدا کرنے کی ضرورت ہے اور ان کو وسائل مہیا کرانے کی ضرورت ہے۔ والدین کو اپنے بچوں کی پرورش اس طرح کرنی چاہیے کہ ان کے اندر اعتماد پیدا ہو سکے اور جس فن میں انھیں دلچسپی ہے ان کو صحیح پلیٹ فارم مہیا ہو سکے۔ ہمیں اپنے بچوں کا ذہن اس طرف راغب کرنے کی ضرورت ہے کہ وہ اپنے اندر بیداری پیدا کریں تاکہ ان کے اندر اعتماد پیدا ہو۔ ان کی حوصلہ افزائی کریں اور ان کے ذوق کا خیال رکھیں۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ بچوں کے لیے ایک ایسا پلیٹ فارم مہیا کرایا جائے جہاں ان کی تخلیقی صلاحیتیں پروان چڑھ سکیں۔ ان کو مقابلے کے لیے تیار کیا جائے۔ ان کی دلچسپی کا خیال رکھتے ہوئے ان کی تربیت کی جائے۔ ان کو بہتر انسان بنانے کے بارے میں غور وفکر کرنا ہوگا تاکہ آنے والے وقت میں وہ زیادہ سے زیادہ اور بہتر سے بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کر سکیں۔ ان کی صلاحیتوں کو والدین کو پہچاننے کی ضرورت ہے۔ انھیں اس امر پر بھی غور کرنا ہوگا کہ ان بچوں میں خود اعتمادی کی کوئی کمی تو نہیں ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ انھیں وقتاً فوقتاً ان سے بات کر کے ان کی دلچسپی کا پتہ لگانا چاہیے تاکہ جس میدان میں بھی وہ جانا چاہتے ہیں اس میں وہ کامیاب ہو سکیں۔ والدین کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے بچوں کا ہر طرح سے تعاون کریں۔ انسان میں صلاحیتوں کی کوئی کمی نہیں ہوتی لیکن وقت اور حالات انسان کی صلاحیتوں کو دبا دیتے ہیں۔ ہمیں اس بات کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ والدین کو اپنے بچوں کی تخلیقی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے لیے ان کے ذوق کے مطابق انھیں وسائل مہیا کرانے ہوں گے تاکہ انھیں اپنی دلچسپی کے مطابق آگے بڑھنے میں آسانی ہو۔ والدین کو ان کی بھرپور حوصلہ افزائی بھی کرنی چاہیے تاکہ ان کے اندر اعتماد پیدا ہو۔ ان سے کسی بھی مسئلے پر کھل کر بات کرنی ضروری ہے کیونکہ اسی صورت میں بچوں کے تمام مسائل کا حل تلاش کیا جا سکتا ہے۔

آپ کا

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

ڈاکٹر نشاں زیدی

قمر جمالی

نام: قمر سلطانہ

قلمی نام: قمر جمالی

والد کا نام: محمد جمال شریف، شوہر کا نام: محمد محمود حامد (افسانہ نگار)

تصانیف: شبیہ (افسانوی مجموعہ) 1990، سیوچہ (افسانوی مجموعہ) 1992، سحاب (افسانوی مجموعہ) 2001، زہاب (افسانوی مجموعہ) 2007، صحرا بکف (افسانوی مجموعہ) 2015، سنگریزے (ریڈیو ڈرامے) 1993، انعکاس (تنقیدی مضامین) 2012، نواح ادب (تنقیدی مضامین) (2016)، آتش دان (ناول) 2014۔

انعامات واعزازات: پہلا انعام برائے جملہ کتب (آندھرا پردیش اردو اکادمی) 1995، امتیاز میر ایوارڈ 1997، بیسٹ جرنل ایوارڈ (کتھا دہلی) 1997، لائف ٹائم اچیومینٹ ایوارڈ (اردو اکادمی آندھرا پردیش) 2007، البر داران اردو اعزاز 2017، قمر رئیس ایوارڈ 2018، عصمت چغتائی ایوارڈ 2018

سوال۔ آپ اپنی زندگی کے بارے میں کچھ بتائیں۔ جس گھر میں آپ نے آنکھ کھولی خصوصاً لڑکیوں کے بارے میں اور لڑکیوں کی تعلیم کے بارے میں کہ کیسا ماحول تھا؟

جواب: بیٹا یہ بھی تو ایک اہم سوال ہے۔ میں ایک کاشتکار گھرانے میں پیدا ہوئی۔ میرے والدین کا تعلق آندھرا پرادیش کے ایک موضع سے تھا۔ میری ننہیال زمینداروں کی ہے، وہاں لڑکیوں کو پڑھاتے نہیں ہیں، لیکن میرے والد صاحب جو تھے وہ بہت ہی روشن دماغ تھے۔ میں اپنے والدین کی شادی کے چودہ سال بعد پیدا ہوئی۔ ہمارے بابا چاہتے تھے کہ میں خوب تعلیم حاصل کروں۔ اس لیے انھوں نے حیدرآباد ہجرت کی اور یہاں ایک مکان خرید کر وہاں رہنے لگے۔ میرے والد گاؤں سے پیسہ لاکر میری تعلیم پر خرچ کرتے تھے، انھیں پڑھانے کا بہت شوق تھا۔ اگر کوئی بول بھی دیتا کہ کیوں بلا وجہ بچیوں کو اتنا پڑھاتے ہو تو لڑنے لگ جاتے اور مجھے چاہتے تھے کہ میں وکیل بنوں اور مجھے کبھی بیٹی نہیں بولتے تھے، کہتے تھے ''میرا بیٹا تو وکیل بنے گا اور جو مصیبت میں ہوں گے ان کی مدد کرے گا۔'' جب میں پندرہ سال کی تھی میرے والد کا انتقال ہو گیا۔ میں نے میٹرک پاس کی تھی اور میں آگے پڑھنا چاہتی تھی۔ میں بچپن سے بہت باشعور تھی کبھی کسی کتاب کی ضرورت پڑتی میں گھر جا کر نہیں بولتی تھی، میں سوچتی تھی کہ اگر میں گھر جا کے بولوں گی اور میرے گھر والوں کے لیے ممکن نہیں ہوا تو میرے بابا کو بہت تکلیف ہوگی۔ میری پوری کوشش ہوتی تھی کہ مجھے پڑھائی میں جو دقت ہو رہی ہے وہ امی بابا کو نہیں پتہ چلے۔ بہر کیف والد کے انتقال کے بعد امی کی صحت بہت گر گئی۔ پریشان رہنے لگیں۔ میری والدہ کی خواہش تھی کہ میں ٹیچر بنوں لیکن بعد میں کچھ حالات

ایسے بنے کہ میں کالج میں نہیں پڑھ سکی تو میں نے پرائیویٹ گریجوایشن کیا۔ بی ایڈ نہیں کیا۔ اس سے پہلے مجھے ایک سرکاری محکمہ مالگذاری میں نوکری مل گئی۔ میری دو بہنیں مجھ سے چھوٹی تھیں وہ بھی پڑھ رہی تھیں۔

سوال: یعنی آپ کے والد کے بعد آپ کے اوپر ذمہ داری آگئی۔ اس کے باوجود آپ نے اپنا ادبی سفر کیسے جاری رکھا۔ ادبی سفر کو جاری رکھنے میں کس طرح کے مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔

جواب: ہاں کافی حد تک میرے اوپر ذمہ داری آگئی تھی۔ اس وقت ادبی سفر رک سا گیا تھا۔ لیکن میری ماں نے ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کی۔ میری والدہ اس زمانے میں منشی فاضل تھیں اور اچھی فارسی بولتی تھیں۔ اکثر مجھ سے پوچھتی ''گلستاں، بوستاں بہشتی زیور وغیرہ تمھارے اسکول میں نہیں پڑھاتے کیا۔'' میں اس وقت سوچتی یا اللہ یہ گلستاں بوستاں سب کیا ہے۔ لیکن بعد میں میں نے سب کتابیں پڑھیں۔ میں نے رٹائر ہونے کے بعد فارسی سے ایم اے کیا عثمانیہ یونیورسٹی سے۔ تو نشاں میرے حالات ایسے رہے کہ نوکری ملنے سے قبل چار پانچ سال تک مختلف مدارس میں پڑھاتی رہی، جس مدرسے میں میں نے پڑھایا وہاں کی قابل ٹیچر مانی جاتی تھی۔ الحمدللہ نوکری ملنے کے بعد ہمارے حالات کافی سدھر گئے زندگی آرام سے گزرنے لگی۔ تو اس طرح میں نے بچپن گزارا۔

سوال: حیدرآباد بہت سی بولیوں خاص طور پر اردو کا مسکن رہا ہے۔ آپ کے نزدیک حیدرآباد کو اردو نے کیا دیا اور اس شہر نے اردو کی پذیرائی کس طرح کی۔

جواب: بیٹا جس زمانے میں ہم اسکولنگ کر رہے تھے۔ ہندو ہو یا مسلمان ہو سب اردو بولتے تھے اور ہماری تیلگو ٹیچر بھی اردو ہی بولتی تھی۔ ہمارے آس پاس کے لوگ سب اردو بولتے تھے۔ ہم کسی کو خالہ یا پھوپھی بلاتے تھے، کسی کو چچا تایا ہم کو یہ محسوس ہی نہیں ہوتا تھا کہ ان کے مذاہب الگ الگ ہیں۔ اتنا ہم مل جل کے حیدرآباد میں رہتے تھے اور حیدرآباد میں اردو کا ہی بول بالا تھا۔ آج بھی ہے اور جو یہ مذہبی تعصب ہے، جو کہ ہم اخباروں میں پڑھتے ہیں یہ مجھے سمجھ میں نہیں آتا۔ ہم جس حلقہ میں رہتے ہیں تعصب پسند لوگ ہمارے حلقہ میں تو نہیں ہیں۔ جس زمانے میں میں اردو ادب میں داخل ہوئی یہ شاید میری گھٹی میں پڑا ہوا تھا میں پیدائشی رائٹر ہوں۔ اسکول میں کیا ہوتا تھا اکثر ہماری اردو کی ٹیچر اتنی زیادہ مجھے قابل نہیں لگتی تھی۔ جو سبق ہوتا تھا وہی پڑھانا کافی نہیں ہوتا۔ سبق کے علاوہ استانی جوبات کرتی ہے ہم اس سے بہت کچھ سیکھتے ہیں، لفظ بہ لفظ کوئی پڑھا کے نکل جائے تو وہ کوئی پڑھانا تو ہوا نہیں۔ مجھے یہی محسوس ہوتا

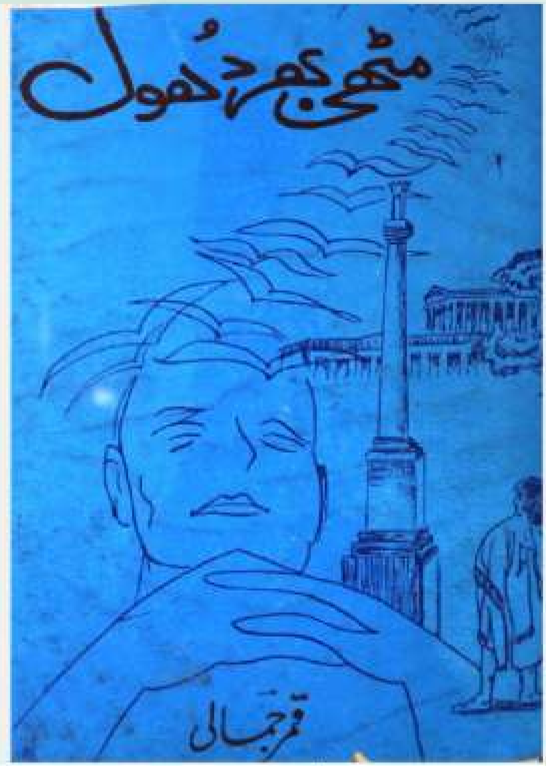

ہے میں بہت اچھی اردو پڑھتی تھی اور اردو کے علاوہ جو بھی رسالہ ہاتھ لگتا میں وہ پڑھتی رہتی، ہماری استانی مجھ سے جب مضمون لکھواتیں تو میں اس میں کردار شامل کر کے اسے کہانی کا روپ دے دیتی تھی۔ اس زمانے میں مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ کہانی کیا ہوتی ہے اور مضمون کیا ہوتا ہے استانی بڑی تعریف کرتی واہ واہ تم نے بہت اچھا لکھا۔ اس وقت ان کو یہ خبر نہیں تھی۔ وہ مجھے ٹوکتی کہ تم نے مضمون کو کہانی کا روپ دے دیا۔ مضامین میں کردار نہیں ہوتے میری ایسی کوئی تربیت نہیں ہوئی۔ تو کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میری ادبی زندگی میں کوئی میرا استاد نہیں ہے۔ میں جب ادبی زندگی میں داخل ہوئی، تو مجھے اس وقت یہ نہیں معلوم تھا کہ مجھے ادبی رسائل میں چھپنا چاہیے۔ میں جو لکھتی تھی اسکول کے بستے میں رکھ لیتی تھی کبھی میں نے نہیں سوچا کہ میں اسے چھپواؤں گی یا کچھ کروں گی۔ اس زمانے میں میں جس اسکول میں پڑھاتی تھی وہاں کے پرنسپل نے ایک دن مجھے اپنے آفس میں بلایا اور کہنے لگے کہ'' آپ کا تعلق کہاں سے ہے۔'' میں نے کہا ''حیدرآباد سے ہے وہیں پیدا ہوئی اور تعلیم حاصل کی۔'' تو کہنے لگے کہ نہیں آپ کی زبان بتاتی ہے کہ کہیں مشرقی ہندوستان سے آپ کے آباؤ اجداد آئے ہوں۔ میں نے کہا نہیں میرے آباؤ اجداد بھی جنوبی ہند کے ہی ہیں۔ تو پھر انھوں نے کہا کیا کچھ لکھتی پڑھتی بھی ہو۔ میں نے کہا مجھے پڑھنے

کا بہت شوق ہے لکھتی بس ایسے ہی ہوں۔ انھوں نے کہا اچھا تم کیا لکھتی ہو مجھے بتاؤ۔ میں شرماتی ہوئی جو بھی میرا پلندہ تھا اس میں سے لے جا کر کچھ مضامین دیے۔ تو وہ مضامین اپنے گھر لے گئے اور انھیں پڑھا اور کہا کہ آپ کس قدر اچھا لکھتی ہیں اس قدر کیوں چھپا کر رکھتی ہیں۔ انھوں نے مجھے ریڈیو اسٹیشن سے متعارف کرایا اس وقت ان کے دوست وہاں ڈائریکٹر تھے۔ میں وہاں کچھ کہانیاں لے کر گئی پھر ان سے ملاقات کی اور بتایا کہ فلاں صاحب نے مجھے بھیجا ہے۔ تو وہ ورق گردانی کرتے رہے اور مجھے گھور کر کہا کہ ”بی بی آپ نے لکھا ہے کیا۔“ میں نے کہا ”ہاں میں نے لکھا ہے۔“ ”اچھا میں آپ کو ایک کانٹریکٹ دیتا ہوں آپ جا کر اپنی ریکارڈنگ کرا دیجئے“ میں پریشان کہ ریکارڈنگ کیا ہوتی ہے۔ پھر انھوں نے ہی ایک اردلی کو بلا کر کہا ”جاؤ انھیں اردو شعبہ میں لے جاؤ۔“ میں وہاں گئی اور بیٹھی رہی اس زمانے میں میرا یہ عالم تھا کہ میں کسی سے بات نہیں کرتی تھی۔ وہاں جب ان لوگوں سے بات ہوئی اور انھوں نے مجھے ریکارڈ کرایا تو الحمدللہ میں نے بہت اچھا کیا۔ دو تین غلطیوں کے سوا جو چھوٹی موٹی کہانی تھی پڑھی۔ اس کے بعد مجھے بہت سے پروگرام ملے اور میں نے بہت لکھا الحمدللہ ویسے آج کل تو میں زیادہ نہیں لکھتی ہوں اور بہت سوچ سمجھ کر لکھتی ہوں۔ اس لیے میری ایک کتاب سے دوسری کتاب کے درمیان سات آٹھ سال کا وقفہ ہے۔ میری نو کتابیں ہیں۔

سوال: میں نے آپ کے افسانے پڑھے۔ آپ نے اردو فکشن کے خزانے میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ میں یہ جاننا چاہوں گی کہ آپ اتنے اونچے عہدے پر رہیں۔ تحصیل دار جیسے مصروف پیشے پر فائز رہتے ہوئے یہ سب لکھنے کے لیے کیسے وقت نکالا اور کہاں سے تحریک ملی۔

جواب: بڑی عجیب بات ہے نشاں! ایسی پوسٹ تھی میری جس میں 24 گھنٹے لوگ مصروف رہتے ہیں۔ میں آٹھ نو بجے تک آفس ہی میں رہتی تھی۔ لیکن کہتے ہیں نہ یہ جو جنون ہے، آرٹ ہو یا لٹریچر دونوں جنون کا تقاضہ کرتے ہیں۔ اگر انسان میں جنونی کیفیت نہ ہو تو وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ جب وقت ملتا میں چھوٹے کاغذوں پر لکھ لیتی اور ایسا کبھی نہیں ہوا کہ میں کوئی افسانہ مکمل کیے بغیر اٹھی ہوں۔ اکثر میں رات میں لکھتی جب میرے بچے سو جاتے اور میری ایک عادت ہے میں کسی بھی چیز کو فوراً نہیں چھپواتی اس کو میں کئی بار نہ پڑھ لوں، ہر طرح سے نہ جانچ لوں، تب تک چھپنے کے لیے نہیں دیتی۔ میں زبان کے بارے میں بہت محتاط ہوں۔ میں بہت حساس بھی ہوں کوئی زبان کو بگاڑ کے بولتا ہے تو مجھے بہت غصہ آتا ہے۔ جب مجھے تکلیف ہوتی ہے میں بول دیتی ہوں۔ لوگ جب تبصرہ کے لیے کتابیں دیتے ہیں تو میں یہی کوشش کرتی ہوں کہ کسی کی دل آزاری نہ ہو۔ لیکن جہاں حق بولنا ہوتا ہے میں وہاں حق بولتی ہوں۔ محاوروں کو لوگ توڑ موڑ کر اپنے طور پر استعمال کرتے ہیں اور آج کل تو بیٹا کچھ لوگوں کا یہ رویہ ہو گیا ہے۔ ویسے زبان کسی کی جاگیر نہیں ہے۔ ہمارا جیسا دل چاہے استعمال کریں گے اور زبان میں اتنی وسعت ہے جیسے دل چاہے پڑھیے لکھیے اور دوسری زبان کے الفاظ داخل کر کے استعمال کیجیے۔ اردو زبان ہے ہی ایسی، اس کا دامن اتنا وسیع ہے یہ ساری باتیں صحیح ہیں۔ لیکن ہمارے متقدین نے جو معیارات درج کیے ہیں ہم اس سے فرار حاصل نہیں کر سکتے۔ ہم کو چاہیے انھیں نظر انداز نہ کریں نہیں تو زبان کا معیار گر جائے گا۔ میں مانتی ہوں کہ علاقے کا فرق پڑتا ہے، لیکن آپ مؤنث کو مذکر کر دیں یہ کہاں کی بات ہے۔ وہ الگ بات ہے جب آپ فکشن میں کسی اور زبان کو استعمال میں لانا چاہتے ہیں تو کسی کردار سے کہلوائیں۔

سوال: آپ کا پہلا افسانہ ”فاصلے مٹ گئے“ جو بیسویں صدی میں شائع ہوا۔ یہ بتایئے اس افسانے کو لکھنے کی تحریک آپ کو کہاں سے ملی۔

جواب: لوگ سوچتے ہیں کہ میں پلان کر کے لکھتی ہوں یا کوئی اندر بیٹھ کر ہم سے لکھواتا ہے، حکم پروردگار کا ہوتا تو ہم لکھتے ہیں۔ مثال کے طور

ہیں۔مثال کے طور پر میرے شوہر کا انتقال ہوا میں ان کی وجہ سے اتنا پریشان رہی کہ میں کچھ لکھ پڑھ نہیں سکتی تھی۔اس کے بعد سے مجھے لکھنے پڑھنے سے الجھن ہوگئی۔میرے شوہر بھی افسانہ نگار تھے ہم دونوں ہی لکھتے تھے دو مختلف قسم کے اذہان کام کرتے تھے۔میرے پہلے قاری میرے شوہر ہی تھے، میرے پہلے نقاد بھی وہی تھے اور ان کی پہلی قاری بھی میں تھی اور پہلی نقاد بھی میں تھی تو ہم لوگ بہت تکرار کر لیتے تھے۔میرے شوہر میرے بہت اچھے دوست تھے تو اصل بات میں یہ کہنا چاہ رہی تھی ان کے بعد مجھے قلم سے وحشت ہوگئی۔ میں کتابوں کی طرف جاتی نہیں، لکھتی نہیں اب بھی وہی عالم ہے، میں اس قدر روتی ہوں۔بہت دعا کرتی ہوں میری نماز میں سب سے پہلی دعا ہوتی ہے کہ اے اللہ میرے ہاتھ میں قلم تھما دے مجھے اس کیفیت سے باہر نکال دے۔میرے اندر احساس بیٹھ گیا کہ میں اب نہیں لکھ سکتی، میں اپنی کتابیں کھول کر دیکھتی ہوں سوچتی ہوں کہ کیا یہ میں نے ہی لکھا ہے۔'شاعر' کے ایڈیٹر افتخار صدیقی مجھے ہر دوسرے تیسرے دن فون کرتے ہیں۔وہ میرے بہت اچھے دوست بھی ہیں۔دلجوئی بھی کرتے ہیں اور ہمیشہ بولتے ہیں تم لکھ سکتی ہو۔تم کو لکھنا ہے اگر تم نہیں لکھو گی تو حیدر آباد خاموش ہو جائے گا۔

سوال: اوہ ان حالات سے تو نکلنا بہت مشکل تھا۔پھر آپ نے دوبارہ ادبی سفر کہاں سے اور کیسے شروع کیا؟

جواب: ہاں میں جن حالات سے گزری اور ابھی بھی ہوں وہ ایسی کیفیت ہے جسے ڈاکٹر بھی نہیں سمجھ پا رہے ہیں۔بہر کیف اب سنبھلنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ بہت زمانے کے بعد میں نے اپنا پہلا افسانہ لکھا تقریباً دو ڈھائی سال کے بعد میں نے اس کا عنوان رکھا ''اضطراب'' اس افسانے کو لکھنے کے بعد میں نے اللہ کا شکر ادا کیا شکرانے کی نماز پڑھی۔تب میں نے سوچا واقعی پروردگار کوئی لکھتا نہیں ہے جب تک حکم نہیں ہوتا۔جب میں نے پہلی کہانی لکھی تھی اس وقت تو بہت آمد تھی۔لیکن آج لکھتے وقت ہمارا دماغ آڑے آجاتا ہے اور جب دماغ درمیان میں آجاتا ہے تو قلم پر بہت حکومت کرتا ہے، دماغ قلم کو پکڑ کے رکھتا ہے۔

سوال۔میم آپ نے تنقید و تحقیق کی طرف بھی توجہ کی۔ایک فکشن نگار کیسی تحقیق کرتا ہے یا ایک محقق کس طرح کے افسانے تخلیق کرتا ہے؟

جواب: ہمارے ایک بزرگ یاد آتے ہیں وہ بہت اچھی اردو جانتے تھے۔انھوں نے مجھ سے کہا تھا قمر تو کبھی تنقید کی طرف پلٹ کر نہیں دیکھنا، تو تحقیق کی طرف پلٹ کر نہیں دیکھنا، کیونکہ تو ایک ذہین لڑکی ہے تیری تخلیق دب جائے گی۔تحقیق اور تنقید تخلیق کو نگل جاتی ہے۔میرے ذہن میں ہمیشہ یہ جملہ رہتا ہے۔تحقیق و تنقید الگ قسم کا ذہن تیار کرتے ہیں۔تنقیدی تحقیقی مضامین الگ اسلوب کا تقاضہ کرتے ہیں۔ میں نے چودہ سال میں اپنی پہلی کہانی لکھی تھی۔اس وقت جو نرم و نازک میرے جذبات تھے، جو میرا قلم تھا بالکل مختلف تھا۔اس وقت میرے ذہن میں کوئی نقشہ نہیں تھا کوئی پلان نہیں تھا۔

سوال: آپ نے لکھنے کا آغاز کون سی صنف سے کیا اور کیوں؟

جواب: میں نے لکھنے کا آغاز افسانے سے کیا۔مضامین تو میں اب بالغ ہونے کے بعد لکھ رہی ہوں۔اب میں ضعیف ہونے کے بعد تنقیدی مضامین لکھ رہی ہوں۔

سوال: آپ کی جب پہلی تخلیق شائع ہوئی، آپ کے افسانے شائع ہوئے تو آپ کے عزیزوں اور چاہنے والوں کا کیا ردعمل رہا۔

جواب: بیٹے میں کیا بتاؤں جب میری پہلی کہانی 'بیسویں صدی' میں چھپی اتنے خط آئے اتنے خط آئے کہ میں حیران رہ گئی۔ایک زمانہ ایسا تھا اس زمانے میں لوگ ایسا ردعمل ظاہر کرتے تھے۔آج تو ہم کتاب دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پلیز پڑھیے۔لیکن یہ وہ زمانہ تھا ادھر افسانہ چھپا ادھر خطوط کی بارش ہوتی تھی۔میرا افسانہ جب چھپا تو میں اس قدر خوش ہوئی کہ جیسے مجھے دنیا جہاں کی دولت مل گئی اور اس کے بعد وہ خطوط ملے ان خطوط سے میری ایسی حوصلہ افزائی ہوئی کہ میں لکھتی گئی اور کبھی پلٹ کر نہیں دیکھا۔

سوال: شادی کے بعد ایک عورت کی دنیا ہی بدل جاتی ہے۔آپ یہ بتائیں شادی کے بعد سسرال کا ماحول کیسا تھا۔آپ کے تخلیقی سفر میں کوئی رکاوٹ تو نہیں آئی؟

جواب: میری شادی 1978 میں ہوئی۔1960 کی میری پیدائش ہے۔میں نے شادی میں بہت گڑبڑ کی۔کیونکہ میں شادی کرنا ہی نہیں چاہتی تھی۔میری دونوں بہنیں پڑھ رہی تھیں۔میں اکیلی کمانے والی تھی ابھی میری بہنیں جاب میں نہیں آئی تھیں اور میں سوچتی تھی میری شادی ہوگئی تو میری ماں اور بہنیں کہاں جائیں گی۔اس لیے میں بہت کوشش کرتی تھی کہ میری شادی نہ ہو۔

سوال: شادی کے بعد ذاتی کاموں کے لیے وقت نکالنا بہت مشکل ہوتا ہے۔شوہر کو بھی وقت دینا ہوتا ہے اور پھر سسرال والوں کے لیے بھی وقت نکالنا ہوتا ہے۔پھر آپ نے اپنے ادبی سفر کو کیسے جاری رکھا۔

جواب: شروع میں تو بہت دقتیں آئیں۔لیکن میرے شوہر کے دوستانہ رویے نے بہت ہمت افزائی کی۔شادی کے وقت تک میں کافی مشہور ہوگئی تھی۔قمر جمالی اپنی شناخت بنا چکی تھی۔میرے والد کا نام ہے محمد

جمال۔

سوال: آپ کے شوہر کو کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی کہ والد کے بجائے میرا نام لگائیں۔

جواب: نہیں وہ تو بہت فخر سے میرا نام لیتے تھے اور وہ خود بھی لکھنے والے تھے اور لکھ کر چھپا کر رکھنے والوں میں سے تھے۔ ان کے دل میں جو بھی آتا وہ اس کا اظہار کرتے اور لکھ کر ایک طرف رکھ دیتے۔ میں نے انھیں اردو دنیا سے متعارف کرایا۔ اس کے بعد وہ آگے بڑھنے لگے۔ پلیٹ فارم ہی نہیں تھا کچھ۔ یہ جو تنظیمیں ہوتی ہیں نا ان کا بہت زیادہ اہم رول ہوتا ہے۔ کیونکہ شناخت بنانے سے پہلے ایک پلیٹ فارم کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ پلیٹ فارم تنظیمیں ہی مہیا کرتی ہیں۔ اس زمانے میں انجمن ترقی پسند مصنفین بہت فعال تنظیم تھی اور اتنی فعال تھی کہ ادھر میری دو کہانیاں ریڈیو سے نشر ہوئیں اور میرا نام لوگوں نے سنا مجھے ترقی پسندوں نے مدعو کیا۔ آپ ہماری انجمن کی رکن بن جائیے۔ میں چالیس سال تک ترقی پسندوں کے ساتھ رہی اور ترقی پسندوں کا زیادہ تر تعلق کمیونزم سے تھا۔ ترقی پسندوں کے جو نظریات ہیں اگر آپ انھیں غور سے پڑھیں تو اسلام سے بہت قریب لگتے ہیں۔ میں مسلمان ہوں مطلب میں اپنے اصولوں پر قائم رہتی ہوں۔ اس کے باوجود میں کمیونسٹ لوگوں کے ساتھ رہی اور ان کے ساتھ میری ذہنی تربیت ہوئی اور ایسے طرار قسم کے لوگوں کے ساتھ رہی جن کی ناک پر مکھی بیٹھے تو ناک کاٹ دیتے۔ ہم اگر تلفظ کی کوئی غلطی کرتے یا اگر تھوڑی بھی اونچ نیچ ہو جاتی تو اسی وقت کھڑے ہو کر لوگوں کے سامنے اس قدر سختی سے ہماری تنبیہ کرتے کہ ہم رونے لگ جاتے۔ لیکن آج وہی تربیت ہمارے کس قدر کام آتی ہے۔

سوال: آپ مختلف اصناف میں لکھتی ہیں اور آپ نے لکھا بھی بہت ہے۔ یہ بتائیے کہ آپ معیاری لکھنے کے لیے کیا ضروری سمجھتی ہیں۔

جواب: معیاری لکھنے کے لیے صرف خیال ہی کافی نہیں ہے۔ آج کل بہت سی کہانیاں آپ پڑھ رہی ہوں گی۔ پہلے تو میں یہ بتانا چاہوں گی کہ کہانی اور افسانہ میں فرق ہے۔ کہانی وہ جو نانی دادی سناتی ہیں اور اس سے نیند آتی ہے۔ افسانہ وہ جو آپ کے شعور کو جھنجھوڑتا ہے آپ کی نیند غائب ہو جاتی ہے۔ ان دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ صرف خیال کو اگر کاغذ پر اتار دو تو وہ کہانی بن جاتی ہے اور افسانے کے لوازم بالکل الگ ہیں۔ اس میں زبان بھی چاہیے آپ کا اسلوب بیان بھی چاہیے۔ آپ کا طرز تحریر بھی چاہیے۔ اچھا افسانہ لکھنے کے لیے اچھی زبان اور طرز تحریر چاہیے۔ افسانے کی ابتداء اور اختتام کو گرفت میں رکھنا بہت ضروری ہے۔

سوال: آپ چند برس رسالہ ”تناظر“ کی مدیر بھی رہیں۔ ادبی رسائل کی بہتری کے لیے آپ کے ذہن میں کچھ تجاویز ہیں۔

جواب: بیٹے تجاویز کیا ہوں گی۔ ادبی رسائل بہت کسمپرسی کی حالت میں ہیں، مدیر بہت پریشان ہیں۔ میں جو سہ ماہی رسالہ چلاتی تھی اس کی بات کرتی ہوں۔ ویسے میں ایک اخبار میں بھی ادبی صفحہ کی نگراں رہی۔ ”ہمارا عوام“ ایک اخبار نکلتا تھا، میں اس کے ادبی صفحہ کی چار سال نگراں رہی۔ وہ اخبار ان لوگوں نے بند کیا۔ وہ مدینہ پبلک ایجوکیشن والوں کا اخبار تھا کافی مشہور ہوا۔ تو میں بتاؤں آپ کو کہ رسالے بہت پریشانی کے عالم میں ہیں۔ سب سے پہلا مسئلہ ہوتا ہے اس کا مالیہ۔ سب سے بڑی بات ہے اس کا مالیہ یہ کہاں سے آئے۔ اس کے لیے اشتہار جمع کرنا بہت ضروری ہے۔ حکومت کے جو مختلف شعبہ جات ہیں، جو رسالے اچھا سسٹم بنائے ہوئے ہیں، ایجنٹ رکھتے ہیں وہ ان کو اشتہار لا کر دیتے ہیں۔ ورنہ آج کل تو دیکھیے بول بالا صرف سرکاری رسالوں کا ہی ہے۔ خانگی رسالے بڑی مشکل سے نکلتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا رسالے زندگی کا سہارا ہوا کرتے تھے ان سے روزی چلا کرتی تھی لیکن آج ایسا بالکل

نہیں ہے۔ میں جب رسالہ چلاتی تھی اور اشتہار کے لیے جاتی تھی تو کچھ لوگ ایسا رویہ اختیار کرتے تھے جیسے میں خیرات مانگنے کے لیے آگئی ہوں۔ بہت مشکل سے پیسے دیتے ہیں لوگ۔ اپنی ذات پر خرچ کرلیں گے ہوٹل میں تین چار ہزار کا کھالیں گے لیکن رسالے کو دینا پسند نہیں کریں گے بہت مشکل سے دیتے ہیں۔ ''یہ رسالہ پڑھ کر کیا ہوگا، ہمارے پروڈکٹ کو کیا فائدہ ہوگا، اس میں ہماری ترسیل کیسے ہوگی، یہ رسالہ کہاں کہاں جاتا ہے۔'' کچھ زبان سے کھل کر نہیں بولتے لیکن ان کا مقصد یہی ہوتا ہے۔ اگر سرکاری ایڈمل جاتی ہے تو بڑا اچھا رہتا ہے لیکن سرکار بھی کب تک دے گی۔

سوال: آپ کی تصانیف کا خصوصاً افسانوں کا انگلش، ہندی، اڑیا اور پنجابی میں ترجمہ ہوا۔ ان زبانوں میں کیسا ردعمل رہا؟

جواب: ایک کتاب میری پنجابی میں آرہی ہے جب میں پنجاب گئی تھی تو وہاں روبینہ شبنم ہیں، انھوں نے میری بہت مدد کی۔ حیدرآباد میں میری کتاب چھپ نہیں پارہی تھی۔ میری یہ کتاب پنجابی میں ترجمہ ہے جو کہ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ میں نے شبنم سے کہا تھا چونکہ حیدرآباد میں ممکن نہیں تھا تو انھوں نے کہا نہیں آپ چھوڑ جایئے میں کروا کے دوں گی۔ انھوں نے کمپوزنگ بھی کرادی پروفریڈنگ بھی کرادی۔ اب وہ چنڈی گڑھ میں چھپوا رہی ہیں۔ میری کہانیاں انگلش میں بھی ترجمہ ہوئیں اور اڑیا میں بھی شائع ہوئیں۔ میں اڑیسہ گئی تھی ساہتیہ اکیڈمی رائٹرس کو گرانٹ دیتی ہے۔ رائٹرس کو سفر کرنا چاہیے اور مختلف زبانوں کے ادیبوں سے ملنا چاہیے۔ یہ موقع ساہتیہ اکاڈمی فراہم کرتی ہے، اس کی ایک تقسیم یہ بھی ہے۔ تو مجھے جب اکیڈمی تھی تو میں اڑیسہ گئی تھی۔ وہاں انیس انجمنوں نے مجھے بلوایا اور بہت اچھے پروگرام ہوئے، میں گورنر کی مہمان رہی دس دن کا سفر تھا میرا۔ اڑیسہ کے ایک نامی رائٹر ہیں ڈاکٹر کرامت علی کرامت نام ہے ان کا میں ان کے گھر بھی رہی۔ وہاں کچھ لوگوں نے میری کہانیاں لیں اور ترجمہ کر کے اڑیہ میں چھاپیں اور انگلش میں تو میں خود بھی ترجمہ کرسکتی ہوں اور ایک اہم بات میں نے لکھنے کی شروعات انگلش سے ہی کی تھی۔ انگلش میں میں نے ابتدا میں کہانیاں لکھیں دو تین نظمیں بھی ہیں میری۔ لیکن اس زمانے میں کوئی انگلش رسالہ نہیں تھا۔ میں شاید بہت آگے جاتی انگلش میں لیکن مجھے کوئی رسالہ ملا ہی نہیں، جس میں میں چھپتی اور آج بھی نہیں ہیں انگلش کے رسالے۔ مجھے اتنا علم تو نہیں ہے لیکن کہتے ہیں لوگ ایک دو رسالے ہیں، جو پابندی سے نکلتے ہیں۔ پتہ نہیں کہاں سے نکلتے ہیں لیکن حیدرآباد میں ایسا کوئی ادبی رسالہ نہیں ہے۔ خیر میری کہانیاں ہندی میں چھپیں اور انگریزی میں بھی بہت اچھا ردعمل ملا۔

سوال: نئے لکھنے والوں کے لیے کچھ مشورہ دینا چاہیں گی؟

جواب: میں بہت چاہتی ہوں کہ میں نئے لکھنے والوں سے مخاطب ہوں۔ یہاں جو انجمنیں چل رہی ہیں میں سبھی انجمنوں میں شامل ہوں میں انجمنوں سے اصرار کرتی ہوں کہ آپ کوئی ورکشاپ چلائیں۔ اگر کوئی ورک شاپ ہوتا ہے تو اس میں ہم تربیت کرسکتے ہیں۔ کم از کم سال میں ایک بار ایسا ورک شاپ ہونا چاہیے جہاں ہم بات کرسکیں۔ میں یہ کہنا چاہوں گی نئی نسل سے کہ اگر آپ کے اندر وہ جراثیم ہیں اگر آپ لکھ رہے ہیں، جو ذہن میں آیا اسے لکھ دیا اور بھاگتے دوڑتے گئے کہیں چھپوا دیا تو یہ کوئی تخلیق نہیں ہے۔ بیسویں صدی کے اختتام میں جو نئی نسل ابھر کے آئی ہے ان لوگوں کا یہی رویہ ہے۔ آپ نے جو لکھا ہے اسے پڑھیں اور دیکھیں اس میں کتنی غلطیاں ہیں اور اتنی غلطیاں ہوتی ہیں زبان و بیان کی۔ پہلے لکھو اس کے بعد دس بار پڑھو پھر جانچو کہ کیا یہ چیز عوام میں پہنچنے کے قابل ہے۔ کیا اس کے چھپنے سے آپ کے قد میں اضافہ ہوگا۔ ہاں مجھے یہ پسند نہیں ہے آپ اپنا مواد غیر صحت مند حالت میں قاری تک پہنچائیں۔ کیونکہ کتاب جو ہوتی ہے وہ ایک دستاویز ہوتی ہے اگر آپ کو کوئی لفظ دیکھنا ہے تو آپ کتاب سے چیک کرسکتے ہیں۔ کبھی یوں ہوتا ہے دیکھیے کوئی لفظ سامنے آیا کہتے ہیں ارے یہ لفظ دیکھیں قمر جمالی نے کیسے استعمال کیا ہے چلو ان کی کہانیاں دیکھتے ہیں یا جیلانی بانو نے کیسے استعمال کیا ہے، یا اس کو نگار عظیم نے کیسے استعمال کیا ہے۔ تو کتاب ایک دستاویز ہے۔ لکھنے والے کو اتنا شعور ہونا چاہیے کہ اگر کوئی کسی لفظ کو آنکنے بیٹھ جائے تو اس میں کوئی عیب نہ نکلے۔ تو میں نئی نسل کو یہ ہدایت کرنا چاہتی ہوں کہ یہ ضروری ہے کہ آپ کے ذہن میں جو آتا ہے پہلے اس کو کاغذ پر منتقل کرو، اس کو لکھو، اس کو محفوظ کر کے رکھو، فرصت کے اوقات میں اسے ایک بار نہیں دس بار پڑھو، اس کی زبان کی صحت کے ساتھ پڑھو اور بیان سے پڑھو، خیال کی روانی سے پڑھو، زبان کے معیار سے پڑھو، ذہن میں مختلف خاکے بنا کے پڑھو اور اس کو جانچو ایک ممتحن کی طرح دیکھو کیا ہم نے لکھا ہے۔ اس کے بعد اسے چھپنے کے لیے دو۔

□□□

Dr. Nishan Zaidi
B-63/S-2,D.L.F. Colony
Sahibabad
Distt.Ghaziabad-201005 (U.P)

ش بانو ادیب کی افسانہ نگاری

محمد دانش غنی

ترقی پسند تحریک نے ادب برائے ادب کے نظریے سے انحراف کیا اور ادب برائے زندگی کا نعرہ بلند کیا اور ادب میں مقصدیت اور افادیت کی بات بھی کی۔ ادب کو نہ صرف زندگی بلکہ معاشرے کی اصلاح کا ذریعہ بھی بنایا گیا۔ لیکن 1960 کے آس پاس جب جدیدیت کا رجحان بڑھا تو اس نے سب کچھ تہس نہس کر دیا اور ہر طرف اپنا تسلط جمانا شروع کر دیا۔ ان حالات میں بیشتر روایت پسندوں اور ترقی پسندوں نے جدیدیت کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے مکمل طور پر اپنے وسیلۂ اظہار کے لیے جدیدیت کے رنگ کو اپنا لیا۔ اس وقت جو نئے تخلیق کار اپنے تخلیقی سفر کی شروعات کرنے کے لیے راہیں متعین کر رہے تھے وہ جدیدیت کی اس راہ پر چل پڑے جس پر ان کے ہم عصروں کا جمِ غفیر رواں دواں تھا۔ لیکن اس وقت کے تازہ واردانِ بساطِ نو میں چند ایسے بھی تھے جنھیں اپنی صحت مند اور لازوال کلاسیکی روایت عزیز تھی اور جو اپنی روایت کے پہلو بہ پہلو ترقی پسند نظریات رکھتے ہوئے جدیدیت کو بھی لبیک کہہ رہے تھے اور ترقی پسندی اور جدیدیت کی خوشگوار آمیزش سے ایک شگفتگی آمیز لہجہ اور حیات آفریں رنگ و آہنگ کے وسیلے سے اپنی منفرد شناخت کے نقوش قرطاسِ شعر و ادب پر مرتسم کر رہے تھے۔ ان میں ش بانو ادیب کا شمار بھی ہوتا ہے۔

ش بانو ادیب ایک ایسے وقت میں اردو افسانے کے منظر نامے پر نمودار ہوئیں جب خواتین افسانہ نگاروں کی ایک پوری کھیپ اس میدان میں سرگرمِ عمل تھی اور خواتین افسانہ نگاروں کے حوالے سے اردو افسانہ ایک مخصوص سمت میں سفر کر رہا تھا۔ افسانہ نگاری کے اس ماحول میں کسی کے لیے بھی اپنی انفرادیت قائم کرنا کافی مشکل ہوتا لیکن ش بانو ادیب نے اپنی مخصوص تخلیقی صلاحیتوں کے بل پر اپنی انفرادیت قائم کرنے میں کامیابی حاصل کی۔

عصرِ حاضر کے ممتاز و معتبر افسانہ نگار اور نقاد اقبال انصاری لکھتے ہیں:

> ’’ہمیں یاد ہے کہ ساٹھ اور ستر کی دہائی میں شکیلہ (ش بانو ادیب) ہمیں خاتونِ مشرق، شمع خیال، ہند سماچار، پرواز ٹکسٹائل، جہاں نما اور نشانِ نگارش میں نظر آتی تھیں اور ان کے افسانوں نے ہمیں متاثر کیا تھا۔ اس لیے وہ ہمیں یاد بھی رہ گئیں اور ان کے افسانوں کے چند جملے بھی یا ان جملوں کا ایک دھندلا سا عکس آج بھی ذہن میں ہے۔ اس دور میں اگر کوئی خاتون افسانہ نگار قاری کو متاثر کر لیتی تھی تو یہ بڑی بات مانی جاتی تھی کیونکہ وہ عصمت چغتائی، واجدہ تبسم، رضیہ سجاد ظہیر اور عفت موہانی کا دور تھا۔ یہ خواتین اس دور میں افسانوی ادب پر چھائی ہوئی تھیں اور ہمیں یاد ہے کہ بہت سی نئی لکھنے والی غالباً نادانستگی میں اپنے افسانوں میں ادب کی ان شہزادیوں کی نقل کیا کرتی تھیں مگر شکیلہ (ش بانو ادیب) نے ایسا نہیں کیا۔ انھوں نے اپنے لیے ایک نئی راہ نکالی۔ دنیا کو، سماج کو، معاشرے کو، انسان کو، انسانیت کو، حیوانیت کو۔۔۔۔۔ ہر چیز کو پردے میں رہتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا، اسے شعور سے پہچانا، اپنے افسانوی ذہن سے ان چیزوں اور ان کے عناصر سے ایک رشتہ استوار کیا اور اپنے ڈھنگ، اپنے طور سے افسانے کے تانے بانے تیار کیے اور افسانے سپردِ قلم کیے۔۔۔۔۔ اس ڈھنگ اور اس طور نے ش بانو ادیب کو ایک الگ پہچان دی۔‘‘

(ش بانو ادیب: یہیں کہیں ہے، مرتبین عمران عظیم اور ساحر داؤد نگری، صفحہ نمبر 25)

مذکورہ بالا اقتباس کی روشنی میں یہ بات نہایت ہی یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ش بانو ادیب کے افسانے مواد کے اعتبار سے ایسے سماجی موضوعات پر مبنی ہیں جنھیں اجتماعی مسائل کہا جا سکتا ہے۔ ان مسائل کو انھوں نے فنکارانہ دردمندی کے ساتھ اس طرح بیان کیا ہے کہ بات دل سے نکلتی ہے اور دل تک پہنچ بھی جاتی ہے۔ ان کے افسانوں میں اکیسویں صدی کے موضوعات جا بجا ملتے ہیں جن میں زندگی کی کلفتوں، محرومیوں اور مجبوریوں

کی عکاسی صاف صاف نظر آتی ہے۔ ان میں عصرِ حاضر کی کثافتیں، تلخیاں، مغربی تہذیب کے برے اثرات، استحصال اور جدوجہد شامل ہے۔

"موت کے پھول" ش بانو ادیب کا ایک ایسا ہی افسانہ ہے جس میں انھوں نے عصرِ حاضر کی عیاشیوں پر سخت چوٹ کی ہے۔ افسانے کا ہیرو پھول ہے، جس کی دوستی ستیش اور رام پرساد نامی دو نوجوانوں سے ہوجاتی ہے۔ اگرچہ پھول ایک نیک لڑکا تھا اور اپنے ان دونوں دوستوں کی عیاشیوں کو پسند بھی نہیں کرتا تھا لیکن بری صحبت کا اثر ضرور ہوتا ہے۔ لہٰذا پھول کی پاکیزگی بھی دوستوں کی صحبت کی نذر ہوجاتی ہے اور وہ ستیش، رام پرساد کی باتوں میں آکر ایک لڑکی کے ساتھ جو ستیش اور رام پرساد کی واقف کار ہوتی ہے زنا کاری کے لیے رضامند ہوجاتا ہے اور وہ اس کمرے میں جیسے ہی داخل ہوتا ہے جہاں اس کے دوست پہلے ہی زنا کر چکے ہوتے ہیں تو اپنی بہن رنجنا کی آواز سن کر حیران اور پھر کمرے میں رنجنا کو دیکھ کر اس قدر پشیمان ہوتا ہے کہ ایک بجلی کے بلب کے ہولڈر میں اپنی انگلی ڈال کر سوئچ آن کر دیتا ہے اور کرنٹ لگنے سے مرجاتا ہے۔ اپنے بھائی پھول کی حالت دیکھ کر رنجنا چیختی ہے اور اسے بچانے کی کوشش کرتی ہے لیکن وہ جیسے ہی اپنے بھائی کو ہاتھ لگاتی ہے تو بجلی کا کرنٹ اس میں بھی سرایت کر جاتا ہے اور وہ بھی مرجاتی ہے۔ ستیش اور رام پرساد یہ منظر دیکھ کر حیران و پریشان ہوجاتے ہیں اور کہانی اپنے اختتام کو پہنچ جاتی ہے۔ یہ افسانہ جہاں آج کے پراگندہ ماحول کی عکاسی کرتا ہے وہیں یہ پیغام بھی دیتا ہے کہ بدکاری سے دور رہ کر ایک صاف ستھری اور پاکیزہ زندگی گزارنی چاہیے۔

اسی طرح ان کا ایک افسانہ "شکار" بھی ہے جس کے مرکزی کردار اکرم اور رجنا ہیں جو شکار کی تلاش میں خود ہی شکار ہوجاتے ہیں لیکن لڑکیوں کا تعاقب کرنے اور انھیں پریشان کرنے کی عادت سے باز نہیں آتے۔ سینما ہال کے اندھیرے میں اکرم اپنی بہن کو ہی انجانے میں چھیڑ دیتا ہے اور پھر گال پر زوردار تھپڑ کھاتا ہے۔ انٹرول میں وہ دیکھتا ہے کہ جس لڑکی کو اس نے چھیڑا ہے وہ کوئی اور نہیں بلکہ اس کی اپنی بہن ہے۔

مذکورہ بالا دونوں افسانے قاری کے ذہن کو کچوکے لگاتے ہیں۔ تمام صورتِ حال ایک تناؤ کی شکل میں فرد کی اکائی پر مرکوز ہوجاتی ہے۔ ان افسانوں کے فن پر تخلیق کار کی گرفت مضبوط ہے۔ لہٰذا افسانہ نگاری کے تمام تشکیلی عناصر مثلاً پلاٹ، کردار، جذئیات نگاری، نفسیاتی ژرف بینی اور فضا بندی کا استعمال اتنی مشاقی سے کیا گیا ہے کہ تمام تشکیلی عناصر اس میں ڈوب جاتے ہیں۔ ان دونوں افسانوں میں اسلوب کی رنگارنگی سے پیرایۂ اظہار خوبصورت ہوگیا ہے۔ دونوں کہانیاں عام سی ہیں لیکن تکنیک اور بیانیہ کے زور پر دونوں کو افسانے میں بدل دیا گیا ہے۔ ش بانو ادیب کہانی میں منظر، ماحول اور امیج کو ابھارنے کا ہنر جانتی تھیں۔

ش بانو ادیب کے افسانوں کی ایک اہم خصوصیت سادہ بیانی ہے اور اسی کے بل پر انھوں نے اپنی انفرادیت قائم کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ ان کے افسانے اپنی تمام تر گیرائی و گہرائی کے باوجود نہایت سادہ دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے افسانوں کی ایک بڑی خوبی ان کا اسلوب بیان ہے، جس نے ان کی نثر کو دلکش بنا دیا ہے۔ زبان و بیان کی دلکشی کے ساتھ ان کی نظر کردار کی نفسیات اور سماجی معاملات پر بھی بہت گہری ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملوں سے کردار کی نفسیات کو اس طرح اجاگر کیا گیا ہے کہ کردار کا باطن ظاہر میں بدل جاتا ہے۔ یہ خوبی بہت کم افسانہ نگاروں میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ خونی، ممتا کے متوالے، شکار، موت کے پھول، دوسرا رخ، اللہ مالک ہے، جیل یاترا، فطرت، چندا ماما دور کے وغیرہ ش بانو ادیب کے ایسے افسانے ہیں جن میں مشاہدے کی وسعت اور زندگی کی سچائیوں سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ ملتا ہے۔ ش بانو ادیب کے ان افسانوں میں ان کی غیر معمولی تخلیقی صلاحیت بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ پروفیسر شہپر رسول ان کے افسانوں کے متعلق رقم طراز ہیں:

> "ش بانو ادیب کے افسانوں میں دنیا کے مختلف رنگوں کو دیکھا جاسکتا ہے۔ ان کے یہاں عہدِ حاضر کی بہت سی پرچھائیاں نظر آتی ہیں۔ ان کے افسانوں میں انسانی ضروریات، دیہات کی منظر کشی، خدا کی ذاتِ اقدس پر یقینِ کامل، خاندانی روایات کا فقدان، تہذیب کی شکست و ریخت، سماج کا مسخ چہرہ، نانی اور دادی کے قصوں کا وسیع منظر اور گھریلو چولہوں کی راکھ بھی کچھ نظر آتی ہیں۔ ان کے افسانے اپنے قاری سے باہمی سروکار رکھتے ہیں۔ ش بانو ادیب افسانوں کے ذریعہ صدائے احتجاج بلند کرتی ہیں لیکن معقول نظام کے ساتھ۔ جب وہ معاشرہ کی اصلاح کرنا چاہتی ہیں تو اس کی گھناؤنی تصویر اپنے قاری کو دکھا کر اسے جھنجھوڑتی ہیں۔"

(ش بانو ادیب: یہیں کہیں ہے، مرتبین عمران عظیم اور ساحر داؤد نگری، صفحہ نمبر 29)

اس اعتبار سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ش بانو ادیب کے افسانے سماجی دوغلے پن کو بڑی خوبصورتی سے اجاگر کرتے ہیں۔ انھوں نے سماج، مذہب اور سیاست سے چھوٹے چھوٹے موضوعات لے کر بڑے بہترین افسانے تحریر کیے ہیں۔ ملاحظہ کیجئے۔

"میری کہانی ایک رستا ہوا ناسور ہے، میں ظلمت کے تاریک پردوں میں رہتی ہوں۔ میری آنکھیں جلتے آنسوؤں کا سمندر ہیں ۔ آؤ میرے قریب آؤ ۔ میری کہانی دیدہ و دل کی گہرائیوں میں سمو کر میرے رنج وغم میں ڈوب جاؤ اس لیے کہ میں بھی تمھارے دیش کی ایک بھکارن ہوں ۔ میرا غم پورے دیش کا دل ہلا دینے والا غم ہے۔ آج میں اپنے ماضی کے سینے کو تار تار کیے دیتی ہوں۔ میں وہ ایک معصوم تصویر تھی جس پر شفق کا گمان ہوتا تھا۔ زندگی گویا حسن کا مرقع تھی ۔ حسین لطافتوں سے مزین تھی ۔ میری پھوٹی ہوئی تقدیر نے میرے ماتا پتا سے شکوہ وگلہ کیا۔ بڑے بڑے شریف ورئیس خاندان کے نوجوانوں نے میرے لیے پیغامات بھیجے ۔ سفارشیں کرائیں لیکن میرے ماتا پتا نے ان کی تمام درخواستیں نامنظور کردیں اور اس مکر وفریب کے پتلے ظالم منوہر کو جو آج میرا پتی ہے میری زندگی میری بہاریں سونپ دیں۔"

(افسانہ "خونی"، بشمولہ "ش بانو ادیب: یہیں کہیں ہے"، مرتبین عمران عظیم اور ساحر داؤد نگری، صفحہ نمبر 115)

یہ محض جملوں کی ساخت کے وسیلے سے بنائی گئی ایک عبارت نہیں ہے بلکہ ایک باشعور اور ہوشمند خاتون افسانہ نگار کی عصری حسیت اور ان کا تخلیقی وژن ہے جو عصرِ حاضر میں ہر عورت کا مقدر ہے۔ اس افسانے میں ایک دولت مند "منوہر" بہت سی لڑکیوں کو مسل کر اپنی شہوت کا نشانہ بناتا ہے اور وہ اس کا تمنائی بھی ہے کہ اس کی بیوی اس کے لیے نئی اور نوجوان لڑکیوں کو بہلا پھسلا کر لانے کا کام کرے اور جب وہ ایسا کرنے سے منع کر دیتی ہے تو وہ اسے مارتا ہے، پیٹتا ہے اور دوسری شادی رچانے کی کوشش کرتا ہے جسے یہ بھارتیہ ناری گوارہ نہیں کرتی اور اس کے سامنے ڈٹ کر کھڑی ہوجاتی ہے۔ یہ اقتباس دیکھیے ۔

"آج وہ آدم خور مجھ سے منہ موڑ کر دوسری شادی کرنے میں مصروف ہے۔ ہاں! اگر میں اس ذلیل کو دیش کی چھوکریاں ہر روز لا دیا کرتی تو وہ مجھ کو بخوشی رکھتا، دوسری شادی کا خیال تک بھی بیدار نہ ہوتا مگر میں نے دھرم کو ہاتھ سے نہ جانے دیا اور اس دولت کے پجاری کے جذبات واحساسات کو ٹھوکر لگادی اور وہ مجھ کو ٹھوکر مار کر کسی دوسری جوانی سے کھیلنے کے لیے جارہا ہے۔"

(افسانہ "خونی"، بشمولہ "ش بانو ادیب: یہیں کہیں ہے"، مرتبین عمران عظیم اور ساحر داؤد نگری، صفحہ نمبر 116)

اور پھر اپنے مغموم اور ستم رسیدہ دل کی بھڑاس نکالتی ہے۔ خود اس کو اور سماج کے ٹھیکیداروں کو خوب سناتی ہے اور پھر انتقامی کارروائی کے لیے خود کو تیار کرتی ہے ۔ عین شادی کے وقت وہ کار کے نیچے آکر اپنی جان قربان کر دیتی ہے۔ نتیجتاً وہ وحشی درندہ لوگوں کی مار کھا کر حوالات پہنچ جاتا ہے۔ یہ افسانہ ہمارے سماجی رویوں اور دولت کے ٹھیکیداروں کے سیاہ کارناموں پر بھرپور طنز ہے جسے افسانہ نگار نے بڑی فن کاری کے ساتھ رقم کیا ہے۔

ان زندہ مثالوں کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ش بانو ادیب نے اپنے افسانوں میں نہ صرف مختلف النوع موضوعات کو پیش کیا ہے بلکہ وہ اپنے مشاہدات کو فن کے قالب میں ڈھالنے کا ہنر بھی بخوبی جانتی تھیں۔ ان کے افسانے سماجی، سیاسی، معاشرتی، ثقافتی، فکری اور تاریخی پہلوؤں کو بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کرتے ہیں ۔ ان کی کردار نگاری اپنی خصوصیات کے لحاظ سے انفرادی رنگ وآہنگ کی حامل ہے۔ ان کے کردار حقیقت نگاری کا ایک اعلیٰ نمونہ ہیں اور وہ متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے کردار زمینی ہوتے ہیں جو زمینی حقائق کے آئینہ دار بھی ہیں۔ اسی خوبی نے ان کے افسانوں میں حقیقت کا رنگ بھر دیا ہے ۔ اپنے بیشتر افسانوں میں انھوں نے متعدد زمینی کرداروں کو پیش کیا ہے۔ مثال کے طور پر "جیل یاترا" میں اپرادھی سنیل اور داروغہ ونے کمار، "اللہ مالک ہے" کا ریاض احمد، "فطرت" کے نوید اور رشید، "خونی" میں منوہر وغیرہ۔

بظاہر ش بانو ادیب کی کہانیوں کا کینوس زیادہ وسیع نہیں ہے بلکہ خاندانی زندگی اور اس کے ٹوٹتے بکھرتے رشتوں تک محدود ہے لیکن انھوں نے زندگی کے مختلف رنگوں سے اپنی کہانی کے بام ودر کچھ اس طرح روشن کیے ہیں کہ انسانی فطرت کے ہزاروں نقوش اور رنگارنگ جذبات و کیفیات ان کی کہانیوں میں سمٹ آئی ہیں۔ ان کہانیوں میں جبر حالات، خوابوں کے ٹوٹنے بکھرنے کا منظر، رنگین جسموں کی رعنائیاں، روح کے ہنستے مسکراتے زخم ہیں تو کہیں سارے جہاں کی اداسیاں سمیٹے ہوئے چہرے مختلف انداز اور مختلف رنگ وروپ میں ہمارے سامنے آتے ہیں اور زندگی کی کتنی حقیقتوں سے پردے اٹھا جاتے ہیں۔

○○○

Dr. Mohd. Danish Gani
Dept. of Urdu
Gogate Jogalekar College
Ratnagiri - 415 612 (MS)

ڈاکٹر مسرت

انگریزی کے ساتھ ساتھ ہمیں اردو زبان کو بھی اپنانا ہوگا

ثنا نیاز

پچھلے دنوں دہلی کی سی بی ایس ای ٹاپر ثنا نیاز قومی اردو کونسل کے دفتر تشریف لائیں تھیں اور انھیں کونسل میں ایک استقبالیہ دیا گیا۔ ثنا نیاز نے یہ کامیابی اردو میڈیم سے حاصل کی۔ اردو زبان اور اس کے چاہنے والوں کے لیے یقیناً یہ ایک اچھی خبر ہے۔ انھوں نے اپنے سامنے اپنی گفتگو کے دوران اپنے تجربات بتائے۔ پیش ہے ان سے کی گئی گفتگو کے اقتباسات:

س: اردو میڈیم اسکول میں آپ کا تعلیمی تجربہ کیسا رہا۔ اسکول میں کیسا ماحول تھا؟

ج: اسکول میں سبھی لوگ بہت زیادہ معاون تھے۔ پرنسپل میڈم بھی اپنا بھرپور تعاون دیتی تھیں۔ پرنسپل میڈم کے ساتھ ساتھ دوسرے سبجیکٹ کی ٹیچرس کا بھی تعاون حاصل تھا۔

س: آپ کے موضوعات بارہویں میں کیا کیا تھے؟

ج: انگریزی، اردو، ہسٹری، پولیٹیکل سائنس، سوشیالوجی اور ہوم سائنس۔

س: اردو میڈیم اسکولوں میں اساتذہ کا کیسا تعاون رہتا ہے؟

ج: اسکول میں اساتذہ بہت زیادہ تعاون دیتے ہیں۔ نوٹس بنانے میں بھی ٹیچرس مدد کرتی ہیں۔ اگر ترجمہ کرنے میں کوئی دقت آتی ہے تو اس میں بھی وہ اپنا تعاون دیتی ہیں۔

س: اردو آپ کا اختیاری پرچہ تھا یا آپ نے کسی مجبوری کے تحت اس کو لیا تھا؟

ج: مجھے اردو زبان کو آگے بڑھانا تھا۔ لوگوں کی منفی سوچ کو بدلنا تھا۔ لوگ اردو زبان کو لے کر منفی رویہ رکھتے ہیں۔ کچھ لوگوں کی یہ رائے ہے کہ اردو زبان کے سہارے ہم آگے نہیں بڑھ سکتے۔ مجھے اس Myth کو توڑنا تھا۔

س: اردو میڈیم اسکول میں پڑھائی کے دوران آپ کو کیا کیا پریشانی درپیش تھیں؟

ج: سوشیالوجی میں کتاب اردو میں دستیاب نہیں تھی۔ انگریزی اور ہندی میں موجود تھی۔ میں نے ہندی اور انگریزی دونوں کتابوں سے اردو میں نوٹس بنائے اور امتحان کی تیاری کی۔ سپورٹ میٹیریل بھی ہندی میں ہی تھا۔ میں نے ہندی سے اردو میں ترجمہ کیا۔

س: موضوعات کا مواد ہندی میں دستیاب تھا یا انگریزی زبان میں؟

ج: دونوں ہی زبانوں میں موجود تھا۔ لیکن میں نے اس کو اردو زبان میں ترجمہ کیا اور اپنے امتحان کی تیاری مکمل کی۔

س: آپ کے والدین کا تعاون کیسا تھا؟

ج: میرے والدین میری ہر قدم پر رہنمائی کرتے ہیں۔ میرے والد چاہتے ہیں کہ میں اعلیٰ سے اعلیٰ مقام حاصل کروں۔ اپنے پیروں پر کھڑی ہو سکوں۔ میرے والد لڑکیوں کی تعلیم کو لے کر مثبت سوچ رکھتے ہیں اور ان کو تعلیم کے میدان میں آگے دیکھنا چاہتے ہیں۔

س: انگریزی میڈیم آپ نے کیوں نہیں چنا۔ اردو میڈیم سے پڑھائی کرنے کی کوئی خاص وجہ؟

ج: اردو بہت میٹھی زبان ہے۔ مجھے اس زبان کے ذریعے یہ بتانا تھا کہ اردو میڈیم سے پڑھائی کرکے بھی ہم آگے بڑھ سکتے ہیں۔ اپنا مستقبل سنوار سکتے ہیں۔ صرف انگریزی میڈیم سے پڑھ کر ہی ہم اپنا کیریئر نہیں بنا سکتے بلکہ اردو زبان میں تعلیم حاصل کرکے بھی ہم مستقبل میں کسی بھی میدان میں جا سکتے ہیں۔

س: سرکاری اسکولوں میں پڑھائی کا معیار کیسا ہے؟ کیا آپ مطمئن ہیں سرکاری اسکولوں سے؟

ج: ایسا مانا جاتا ہے کہ سرکاری اسکولوں میں پڑھائی نہیں ہوتی۔ سرکاری اسکولوں کا ماحول اچھا نہیں ہوتا لیکن میں نے دیکھا ہے کہ سرکاری اسکولوں کے اساتذہ اپنی ایک بھی کلاس نہیں چھوڑتے اور تمام سبجیکٹ کو بہت اچھا پڑھاتے ہیں۔

س: آپ خالی وقت میں ٹی وی بھی دیکھتی ہیں؟ کس قسم کے پروگرام دیکھنا پسند کرتی ہیں۔ آپ کے شوق کیا کیا ہیں اور خالی وقت میں کیا کرنا پسند کرتی ہیں؟

ج: نیوز دیکھنا پسند کرتی ہوں۔ اس کے علاوہ کھانا بنانا مجھے بہت پسند ہے۔ پینٹنگس کرنا بھی مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔

س: انٹرنیٹ سے بھی آپ نے استفادہ کیا ہے؟

ج: سوشیالوجی سبجیکٹ کی تیاری کرنے میں youtube سے مدد لی۔ youtube پر بھی متعلقہ مواد ہندی میں ہی موجود تھا۔ میں نے وہاں سے بھی ترجمہ کے ذریعے ہی تیاری کی۔

س: جب آپ کو اپنے ٹاپر ہونے کی خبر ملی تو وہ لمحہ آپ کے لیے کیسا تھا؟

ج: میری زندگی کا وہ بہت خوشگوار لمحہ تھا۔ ہم لوگ کھانا کھا رہے تھے جب منیش سسودیا سر (نائب وزیر اعلیٰ، دہلی) کا فون آیا۔ فون پر انھوں نے مجھے یہ خوش خبری دی تھی کہ 'آپ دہلی کی ٹاپر ہیں! مبارک ہو' انھوں نے میرے والدین سے بھی بات کی اور ہم سب کو مبارکباد پیش کی تھی۔

س: آپ متوسط گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس وجہ سے آپ کو اپنی پڑھائی کو لے کر کیا کیا مالی دشواریاں پیش آئیں۔

ج: ویسے تو کوئی بڑی دشواری پیش نہیں آئی لیکن اگر کوئی دشواری آتی بھی ہے تو میرے والدین ہمیں کچھ بھی محسوس نہیں ہونے دیتے۔ اگر ایسا کچھ ہوتا بھی ہے تو والدین ہمیں کچھ بھی بتائے بغیر اس پریشانی کا حل تلاش کر لیتے ہیں۔ اس بات کے لیے میں ان کی بہت شکرگزار ہوں۔

س: اردو میڈیم سے آپ نے پڑھائی کی ہے۔ اردو زبان کے بارے میں آپ کیا سوچتی ہیں اردو کیسی زبان ہے؟

ج: اردو ایک بہت ہی میٹھی زبان ہے۔ اس میں جہاں ایک طرف گل و بلبل کی داستان ہے وہیں دوسری طرف 'انقلاب زندہ باد' کے نعرے بھی ہیں۔ اردو ملی جلی زبان ہے۔ اس میں بہت سی زبانوں کے الفاظ شامل ہیں۔ کوئی بھی اس زبان کو آسانی سے سیکھ سکتا ہے۔ اردو زبان ہم سے دور ہوتی جا رہی ہے۔ میں اس کو آگے فروغ دینا چاہتی ہوں۔ اردو کے تعلق سے جوش کا ایک شعر ہے:

احمد پاک کی خاطر تھا خدا کو منظور
ورنہ قرآن بھی اترتا بہ زبان اردو

اردو زبان میں ہم اپنے جذبات بہترین طریقے سے ظاہر کر سکتے ہیں۔ میں اردو نظموں کو بھی پڑھتی ہوں۔ ان کو پڑھ کر مجھے حوصلہ ملتا ہے آگے بڑھنے کا۔ علامہ اقبال کا ایک شعر ہے:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

اردو میرے نزدیک بہت اہمیت رکھتی ہے۔ ہم جتنی انگریزی زبان بولتے ہیں اس سے کہیں زیادہ ہمارے لیے اردو زبان اہمیت کی حامل ہے۔ انگریزی زبان کے ساتھ ساتھ اردو زبان کو بھی ہمیں اپنانا ہوگا۔

س: مستقبل میں کیا ارادہ رکھتی ہیں۔ کس میدان میں آپ جانا چاہیں گی۔

ج: مستقبل میں آئی۔ اے۔ ایس آفیسر بننا چاہتی ہوں تاکہ مسلم معاشرے کی لڑکیوں کے لیے ایک مثال پیش کر سکوں۔ آئی۔ اے۔ ایس میں بھی اردو بطور مضمون یا میڈیم لینا چاہتی ہوں تاکہ اردو زبان کا فروغ ہو سکے۔ ایک سوچ یہ بھی بن گئی ہے کہ ہم اردو بطور میڈیم لے کر اپنا مستقبل نہیں سنوار سکتے میں اس سوچ کو بدلنا چاہتی ہوں۔

□□□

Dr. Musarrat
F-11/9
Jogabai Extn.
Jamia Nagar, Okhla
New Delhi-110025

شاعرات کے منتخب اشعار

اور کوئی جو نہیں خود کو سہارا سمجھو
رات کالی ہو تو آنکھوں کو ستارا سمجھو

تھک کے بیٹھو گے تو ٹھکرا کے چلے گی دنیا
اپنے جیون کو بھی بہتا ہوا دھارا سمجھو

مریم غزالہ

ہر شہر ہوا ہے شعلہ فشاں ہر سمت دھواں گھنگھور دھواں
جھلسے جھلسائے چہروں میں پہچان کسی کی پائیں کیا

جل رہا ہے بجھ بجھ کے جانے کتنی صدیوں سے
شام کے دھندلکے میں اک چراغ دل تنہا

ناہید اختر

ان اشکوں کی محرومی بھی دیکھی ہے کسی نے
جو آنکھ میں آتے ہیں مگر بہہ نہیں سکتے

کشتی ڈبو دی ساحل امید کے قریب
مجھ کو اگر گلے ہیں تو سب ناخدا سے ہیں

فاطمہ وصیہ جائسی

لرزتے کانپتے پتوں کی بے بسی مت پوچھ
عجیب خوف سا چاروں طرف ہوا کا ہے

یہ جرأتیں بھی اب کہاں کہ ساحلوں کو چھوڑ دیں
وہ لوگ کیسے لوگ تھے جو کشتیاں جلا گئے

رفیعہ شبنم عابدی

پیلے چہرے، ویراں آنکھیں، سوکھے اور پژمردہ لب
ہائے کس نے چھین لیے ہیں قوس قزح کے ساتوں رنگ

چھپائے پھرتے ہیں دامن میں لوگ چہروں کو
کہ جیسے چہروں پہ سب دل کا حال لکھا ہے

حسنیٰ سرور

کسی سراب کی زد میں ہر ایک ساحل ہے
میں جانتی ہوں کہ خود ریت کے بھنور میں ہوں

بہا کے لے گیا سیلاب راستے جن کے
وہ شہر اپنے خیالوں میں اب بھی بستے ہیں

وفا لکھنوی

شہر ویراں کی فضاؤں پہ نہ جاؤ لوگو
آج کل شخص کوئی گھر سے نکلتا ہی نہیں

جو لوگ روایات کی ہیبت سے تھے خاموش
اب ان کے لبوں پر بھی سوال آنے لگا ہے

عرفانہ عزیز

یہ کیوں چمن میں رہ کے مرا جی اداس ہے
یہ کس کے عکس ہیں جو بیاباں سے آئے ہیں

روز نیزوں پہ تمناؤں کے سر آتے ہیں
اب مری فتح کے آثار نظر آتے ہیں

شان معراج

قمر جمالی

ریڈیو ڈرامہ: ایک تعارف

حیدرآباد کی نشرگاہ کا قیام۔ ریڈیو ڈرامہ میں حیدرآبادی خواتین قلمکاروں کا حصہ
آل انڈیا ریڈیو (A.I.R) حیدرآباد کے حوالے سے

ریڈیو ڈرامہ:
یعنی ریڈیو سے نشر ہونے والے ڈرامے

ایسے ڈرامے جو آواز کے ذریعے قوتِ سماعت پر اثر انداز ہوتے ہیں اور انسانی ذہن کو متاثر کر کے اس میں تحریک عمل، کارکردگی اور جدوجہد کا تاثر پیدا کرتے ہیں ریڈیو ڈرامے کہلاتے ہیں۔

یہاں بات چونکہ خواتین کی ڈرامہ نگاری کی ہورہی ہے اور وہ بھی صرف ریڈیو ڈرامہ کی تو یہ جاننا ضروری ہے کہ کیا خواتین اس صنف کی طرف ابتدا ہی سے مردوں کے قافلے میں شامل ہیں؟

اس کا جواب ہے 'نہیں'۔

محققین کا خیال ہے کہ ہندوستان میں سماجی بیداری کا دور وکٹوریائی عہد کے مماثل ہے جہاں ایک طرف تو عورت کو عزت دینے کا ڈھونگ رچا جاتا ہے تو دوسری طرف اس کی انفرادیت، پہچان اور اس کی شخصیت کو کچلا جاتا ہے۔

اگرچہ کہ عورت کی اپنی تشخص کو منوانے کی لڑائی مغرب سے شروع ہوئی مگر انیسویں صدی کی ابتدا میں ہندوستانی عورت خاصی باشعور ہوگئی تھی۔ 1920 کے اوائل میں ہندوستان میں عورتوں کے حالات بہتر ہوئے۔ بالخصوص پہلی آل انڈیا ویمنس کانفرنس جس میں عورتوں کی شخصی آزادی، ان کے تعلیمی حقوق، مزدور عورتوں کے حقوق وغیرہ کو بحث کا موضوع بنایا گیا تب سے عورت کو خس و خاشاک سے اٹھا کر مسندِ عز و تمکنت پر بٹھانے کی شعوری کوشش شروع ہوئی۔

عورت کی اپنی لڑائی ابتداء، پرنٹ میڈیا سے شروع ہوئی۔ یعنی عورت نے خود کو ماس تک پہنچانے کے لیے پرنٹ میڈیا کا سہارا لیا۔ رسالوں، کتابوں اور اخباروں کے ذریعے عوام الناس تک پہنچنے پر اس نے قدرت حاصل کر لی۔ ماس میڈیا میں اخبار عام انسانوں تک پہنچنے کا ایک راست ذریعہ رہا ہے۔ اگرچہ کہ ہندوستان میں ڈرامے کی عمر ڈیڑھ دو سو سال سے بھی کم ہے پھر بھی ڈرامہ ہمیشہ تشہیر کا ذریعہ رہا ہے۔ ڈاکٹر اخلاق اثر کا یہ اقتباس ملاحظہ کریں:

> "راجپوتوں کے حملوں، بدھوں اور برہموں کے ذریعہ مذہب کی تبلیغ اور بعد میں تجارتی مقصد کے استعمال سے سنسکرت ڈرامہ اپنے معیار سے گر گیا۔"

(ڈاکٹر اخلاق اثر، 'ریڈیو ڈرامے کا فن'، ص:16، مکتبہ جامعہ، 1977)

اس اقتباس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ڈرامہ پہلے صرف مذہب کی تبلیغ کے لیے ہوتا تھا جو دیوی، دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لیے اس کے سامنے کھیلا جاتا تھا اور ہندوستان میں اس کی ابتدا سنسکرت سے ہوئی تھی۔ بعد ازاں جب سوال ماس تک پہنچنے کا اٹھا تو ریڈیو ڈرامے کا رخ کیا گیا اور عورت اس قافلے میں ذرا دیر سے شامل ہوئی۔

ریڈیو ڈرامے کے ہیئت اور پابندیاں:

ریڈیو ڈرامہ، اسٹیج ڈرامے سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ فنی اعتبار سے دونوں کے میدان بالکل جداگانہ ہوتے ہیں۔

ریڈیو کی دنیا صرف آواز کی دنیا ہے

> "اگر بات ریڈیو پروگرامس کی ہو تو حیدر آباد کی بے شمار خواتین جیسے محترمہ عظمت عبد القیوم، محترمہ بانو طاہرہ سعید، محترمہ سلطانہ شرف الدین، محترمہ فاطمہ یزدانی، محترمہ فاطمہ عالم علی خان، محترمہ نجمہ نکہت، محترمہ نسیمہ تراب الحسن اور بہت سی خواتین افسانہ نگار، مضامین نگار، انشا پرداز اور شاعرات ان پروگرامس کا حصہ رہی ہیں"

آواز — صرف آواز۔

انسانوں کی، جانوروں کی، موسموں کی، پرندوں کی، چرندوں کی، درندوں کی، ہواؤں کی، طوفانوں کی، موسلا دھار بارشوں کی تو — بوند بوند ٹپکتی موتیوں کی، خاموشی کی، سناٹوں کی تو — گنبدوں میں گونجتی صداؤں کی۔ سرسراہٹوں کی — آہٹوں کی۔ سینوں میں پھنسی سانسوں کی تو — فرط انبساط سے چہکتی کلکاریوں کی۔ یعنی — صرف آواز

ریڈیو ڈرامے کا فن نسبتاً مشکل فن ہے۔ اس کے لیے مصنف کو لفظوں کو صوتی لہروں میں تبدیل کرنے کا ہنر جاننا ضروری ہے۔ اس کی اسکرپٹ بھی کچھ خاص تقاضوں کی متقاضی ہوتی ہے۔

ریڈیو ڈرامے کا پروڈکشن، اسٹیج ڈرامے کی نسبت آسان ہوتا ہے بشرطیکہ اس کو پروڈیوز کرنے والا ریڈیو تکنیک سے اچھی طرح واقف ہو۔ کیونکہ اس ڈرامے میں، میدانِ کارزار ہو یا بازاری ہجوم، شور شرابا ہو یا رقص و موسیقی کسی بھی اظہار کے لیے ہزاروں فنکار اور لمبے چوڑے فلمی سیٹ اپ یا آوٹ ڈور لوکیشنز کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ فن کاروں کی صدا کاری اور تکنیک (Second Effects) کے ذریعے یہ سب ہنگامے ایک بند کمرے جسے اسٹوڈیو کہتے ہیں، میں ریکارڈ کیے جاسکتے ہیں۔ اس لیے کہ ریڈیو ڈرامے کا سبجیکٹ 'ناظر' نہیں بلکہ 'سامع' ہوتا ہے۔

ریڈیو ڈرامے کا دوسرا اہم جزو ہوتا ہے 'مکالمہ' کیونکہ ریڈیو ڈرامہ مکالمے کے ذریعے ہی آگے بڑھتا ہے۔ چونکہ پورے ڈرامے کی تشکیل آواز پر مبنی ہوتی ہے اس لیے اس ڈرامے میں 'مکالمے' کی حیثیت کو دیگر ڈراموں کے مقابلے میں اولیت حاصل ہے۔ ریڈیائی ڈرامے کے مکالموں کو سادہ، عام فہم، شیریں اور کردار کی ذہنی سطح سے مطابقت رکھنے والا ہونا ضروری ہے کیونکہ مکالمہ ہی اس ڈرامے کی اساس ہے۔ مکالمے کا فطری انداز اور اس کی ادائیگی کی خوبی ہی ریڈیو ڈرامے کا اصلی حسن ہے اور یہی خوبی اسے اسٹیج ڈرامے سے ممیز کرتی ہے۔

ریڈیو ڈرامے کی تیسری اہم ضرورت ہے 'صوتی اشارے' جس کے بغیر یہ ڈرامہ مکمل ہو ہی نہیں سکتا۔ جیسے کردار کسی شاہراہ سے گزر رہا ہے، بازار کی چہل پہل، دوڑتی گاڑیوں کی آوازیں۔ یا پھر کردار کمرے میں چل رہا ہے تو قدموں کا قریب سے دور یا دور سے قریب ہونے کی آوازیں یا منظر کسی جھرنے کا ہے تو پانی کے جھر جھر بہنے کی آوازیں۔ بالفاظ دیگر یہ دوسری ضرورت ہی ریڈیو ڈرامے کا (Infrastructure) تیار کرتی ہے۔ یہی وہ عنصر ہے جو اسٹیج ڈرامے کی سب سے بڑی مشکل کو چٹکیوں میں حل کرتا ہے، کیونکہ اگر جنگ کا سین پیش کرنا ہو تو اسٹیج کے لیے ایک چیلنج بن جاتا ہے مگر ریڈیو ڈرامہ میں یہ سین چٹکی بجاتے ہی ریکارڈ ہو سکتا ہے۔ یہ تصادم بند کمرے میں صرف تلواروں کو ٹکرا کر (Toy Guns) کے ذریعہ آرام سے صدا بند ہو سکتا ہے۔

ہندوستان میں ریڈیو ڈرامے کی ابتدا:

ہندوستان میں ریڈیو ڈرامہ کی ابتدا سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ ریڈیو براڈ کاسٹنگ کب سے شروع ہوئی۔ ہندوستان میں 1936 میں 'آل انڈیا ریڈیو' محکمہ دہلی میں قائم ہوا۔

حیدرآباد کی نشرگاہ:

حیدر آباد 17 ستمبر 1948 تک ایک خود مختار سلطنت تھی اور خاندان آصفیہ کے ساتویں حکمران نواب میر عثمان علی خان مطلق العنان بادشاہ تھے۔ نواب میر عثمان علی خان ریاست کی ترقی کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتے اور اعلیٰ صلاحیتوں کے حامل افراد کی ہمت افزائی کرتے تھے۔ ہر دم اپنی ریاست کی ترقی ان کے مطمح نظر رہی۔ چنانچہ جامعہ عثمانیہ کا قیام، فوجی عملے کی باقاعدگی، سکہ، ڈاک، ریلوے اور ہوائی سروس وغیرہ کو بنانے کا سہرا انھیں کے سر جاتا ہے۔ لہٰذا حیدر آباد کی نشرگاہ کا اہتمام بھی انھیں کے زمانے میں شروع ہوا۔

حیدرآباد میں ریڈیو ڈرامہ:

حیدر آباد میں ریڈیو ڈرامے کی عمر بہت کم ہے۔ جب 1939 میں نشرگاہ قائم ہوئی تو ابتدا میں نشرگاہ کی قوت 1/5 کلوواٹ تھی جو صرف حیدر آباد کی ضرورت کے لیے ناکافی تھی۔ اس لیے ایک جدید طاقتور نشرگاہ کی تعمیر کی تجویز پیش ہوئی جس کی رو سے سرور نگر میں ایک نئی اور طاقتور ترسیل گاہ قائم ہوئی۔ اقتباس:

"سرور نگر میں ایک مقام منتخب ہوا۔ جہاں تعمیر خورداد 1345 ف سے شروع ہو کر تیر 1346 ف کو ختم ہوئی۔"

(میر حسن۔ ریڈیو اور نشریات۔ س ن، جنوری 1941ء ص:22)

اب دفتر، چراغ علی کے مکان سے منتقل ہو کر حیرت آباد آ گیا اور نشرگاہ کی تنظیم جدید کی گئی اور پڑھے لکھے لوگوں کا تقرر کیا گیا۔ فضل الرحمٰن صاحب جنھیں 1938 میں B.B.C لندن ٹریننگ کے لیے بھیجا گیا تھا واپس ہوئے تو جناب ظفر الحسن کو 'اناؤنسر'، میر حسن کو 'منتظم تقاریر' اور ایم۔ اے رؤف کو "منتظم موسیقی" مقرر کیا گیا۔

ابتدا میں کوئی منظم پروگرام پیش نہیں کیا جاتا تھا۔ وسائل کی کمی کی وجہ سے معیار اونچا نہ ہو سکا۔ شعبوں میں کوئی تنظیم نہیں تھی۔ کبھی کوئی تقریر یا مضمون، کبھی کوئی گراموفون کا ریکارڈ بجا دیا جاتا۔ خبریں کسی انگریزی خبر نامے سے اور مضامین کسی رسالے سے پڑھ لیے جاتے تھے۔ ایسے میں ڈرامے کا نشر ہونا کسی معجزے سے کم نہ تھا۔ جناب ظفر الحسن خود کو پہلا ریڈیائی ڈرامہ نگار کہتے ہیں۔

اس زمانے میں ریڈیو اسٹیشن سے ایک نیم ماہی رسالہ بھی نکلا کرتا تھا جس میں پندرہ دن کے پروگراموں کی تفصیل ہوا کرتی۔ لہٰذا دکن ریڈیو، حیدرآباد سے 'نوا' اور دکن ریڈیو، اورنگ آباد سے 'ندا' نکلا کرتا تھا جس میں نشر شدہ پروگراموں کی تفصیل ہوتی تھی۔ جناب معین الدین امر نے اپنے تحقیقی مقالے 'حیدرآبادی مصنفین کے ریڈیائی ڈرامے' میں لکھا:

"'نوا' کے جو رسالے دستیاب ہوئے ان میں پروگرام کی فہرست میں یہ اتوار کو رات دس بجے 'ڈرامہ' درج کیا جاتا۔ یہ تفصیل نہیں ملتی کہ ڈرامہ کس کا لکھا ہوا ہے۔ البتہ فیچر کی تفصیلات ملتی ہے۔"

(محمد معین الدین امر۔ حیدرآبادی مصنفین کے ریڈیائی ڈرامے۔ 1987ء ص:84)

ریڈیائی ڈرامے میں حیدرآباد کی خواتین کا حصہ:

اگر بات ریڈیو پروگرامس کی ہو تو حیدرآباد کی بے شمار خواتین جیسے محترمہ عظمت عبدالقیوم، محترمہ بانو طاہرہ سعید، محترمہ سلطانہ شرف الدین، محترمہ فاطمہ یزدانی، محترمہ فاطمہ عالم علی خان، محترمہ نجمہ نکہت، محترمہ نسیمہ تراب الحسن اور بہت سی خواتین افسانہ نگار، مضامین نگار، انشا پرداز اور شاعرات ان پروگرامس کا حصہ رہی ہیں۔ مگر میرا موضوع صرف 'ریڈیو ڈرامہ' تک محدود ہے۔ لہٰذا اس میں ان ہی کا ذکر ہوگا جنھوں نے ریڈیو ڈرامہ میں طبع آزمائی کی ہے۔ یہاں یہ بات بلا تامل کہی جا سکتی ہے کہ حیدرآباد کی ادیباؤں نے اس صنف کی طرف کم توجہ دی ہے۔ حیرت تو اس بات پر کہ ترقی پسند تحریک کے دور میں بہت سی خواتین قلمکار معروف عمل رہیں مگر اس صنف کی طرف توجہ کم ہی رہی۔

غالباً 1975 کی بات ہے جب آل انڈیا ریڈیو، حیدرآباد (A.I.R, Hyd) میں جناب احمد جلیس صاحب نے پروگرام ایکزیکیٹیو (P.Ex) کا عہدہ سنبھالا تو اردو ٹرانسمیشن میں ایک نئی جان آ گئی۔ جلیس صاحب کے ساتھ اس وقت جناب اسلم فرشوری صاحب، جناب جعفر علی خان صاحب، جناب اظہر افسر، محترمہ افشاں جبین صاحبہ اور دیگر اراکین شامل تھے۔ اس ٹیم (Team) نے جناب احمد جلیس صاحب کی رہنمائی میں ریڈیو ڈرامہ پروڈکشن پر نت نئے تجربے کیے۔ سچ تو یہ ہے کہ ریڈیو ڈرامے کو فروغ دینے کا سہرہ اسی ٹیم کے سر جاتا ہے۔ میں نے جب ریڈیو ڈرامہ کے حیدرآبادی خواتین مصنفین کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی تو مجھے نہ ہی کوئی تذکرہ دستیاب ہوا اور نہ ہی ریڈیو ڈرامہ پر کوئی جامع کتاب۔ مجھے معلوم تھا کہ ہمارے شہر کے ایک موصوف جناب معین امر صاحب نے ریڈیو ڈرامہ پر اپنا تحقیقی مقالہ لکھا ہے۔ میں نے وہ کتاب حاصل کی۔ جناب معین امر صاحب اپنے تحقیقی مقالے 'حیدرآبادی مصنفین کے ریڈیائی ڈرامے' میں رقم طراز ہیں:

"ریڈیو ڈراموں کا کوئی تذکرہ یا باضابطہ فہرست نہیں ملتی۔ اکثر ریڈیائی ڈراموں کے ایسے مجموعے بھی عدم دستیاب ہیں جن میں صرف ریڈیو ڈرامے ہی ہوں۔ البتہ ابتدائی ڈرامہ نگاروں کے جن ناموں کا پتہ چلتا ہے ان میں ظفر الحسن، محمد فضل الرحمٰن، عصمت اللہ بیگ، شجاع احمد قائد، انور معظم، سکندر توفیق، نذیر محمد خان، عبدالماجد، عاقل خان اور غلام جیلانی قابل ذکر ہیں۔"

(معین الدین امر۔ حیدرآبادی مصنفین کے ریڈیائی ڈرامے 1987ء ص:93)

میں جناب معین الدین امر صاحب کے اس بیان سے کچھ کچھ متفق بھی ہوں اور نہیں بھی کیونکہ موصوف نے یہ مقالہ 1987 میں طبع کیا۔ تب سے لے کر آج تک درمیان میں ایک طویل عرصہ حائل ہے۔ علاوہ ازیں خود معین امر صاحب نے اپنے اس مقالے کے صفحہ (239) پر رقم کیا ہے کہ محترمہ جیلانی بانو صاحبہ کا ڈراموں کا مجموعہ 'اکیلا' زیر طبع ہے۔ مگر ہزار کوشش کے باوجود راقم کو سوائے اپنے مجموعے 'سنگریزے' کے علاوہ کوئی اور مجموعہ دستیاب نہیں ہوا۔

فاضل مقالہ نگار نے اپنے مقالے کے اختتام پر آل انڈیا ریڈیو، حیدرآباد سے نشر شدہ ڈراموں کی ایک فہرست مرتب کی ہے اس فہرست

میں کل (196) ایک سو چھیانوے ڈرامہ نگاروں کے نام معہ نشر شدہ ڈراموں کے عنوانات اور تاریخ نشر درج ہے۔ یہ فہرست 1970 تا 1983 تک کا احاطہ کرتی ہے۔ اس فہرست کے مطابق 1970 کا پہلا نشر شدہ ڈرامہ جناب جمیل شیدائی کا تحریر کردہ 'اداکار' ہے اور خواتین میں محترمہ جیلانی بانو کا تحریر کیا ہوا ڈرامہ 'دل کی آواز' 1976 میں درج ہے۔

اس طویل فہرست میں صرف (14) چودہ ڈراموں کے نام درج ہیں جنھیں خواتین نے لکھا ہے جو درج ذیل ہیں:

ڈرامہ نمبر	سلسلہ نمبر مطابق فہرست در کتاب و حیدرآبادی مصنفین کے ریڈیائی ڈرامے	نام مصنفہ	ڈرامے کا عنوان	تاریخ نشر
1	31	جیلانی بانو	دل کی آواز	12-09-1976
2	35	قمر جمالی	ریشماں	8-1-1978 (چار مرتبہ نشر ہوا)
3	47	جیلانی بانو	دشت وفا	15-3-1978
4	63	قمر جمالی	رہائی	4-6-1978
5	81	جیلانی بانو	تماشہ	17-9-1978
6	88	قمر جمالی	پورنیا	5-11-78 (دو مرتبہ نشر ہوا)
7	122	جیلانی بانو	پیاسی چڑیا	3-2-1979
8	144	رفیعہ منظور الدین	سب سے بڑا سوال	4-1-1981
9*	153	*سرور فاطمہ	دیدۂ تر	14-6-1981
10	155	قمر جمالی	عشق پیچاں	19-7-1981
11	167	رفیعہ منظور الامین	درد گم نام	14-4-82
12	182	قمر جمالی	تنہا تنہا	13-3-83
13	187	قمر جمالی	سنگ ریزے	15-5-83
14	192	قمر جمالی	جب چاند نکل آئے	4-9-83

(فہرست در کتاب۔ ''حیدرآبادی مصنفین کے ریڈیائی ڈرامے'' 1987، مصنف: محمد معین الدین امر، مطبوعہ نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چار کمان، حیدرآباد، ص: 328-338)

(نوٹ: *شجاع احمد قائد کا ڈرامہ ہے جو موصوف کے انتقال کے بعد ان کی بیگم سرور بیگم کے نام سے نشر ہوا)

ان چودہ ڈراموں میں (7) ڈرامے قمر جمالی کے (4) جیلانی بانو کے (2) رفیعہ منظور الدین اور (1) سرور فاطمہ کا ہے۔

میں نے 14 فروری 2014 بروز جمعہ محترمہ جیلانی بانو صاحبہ سے فون پر بات کی یہ جاننے کے لیے کہ کیا انھوں نے ریڈیو ڈراموں پر مبنی کوئی مجموعہ مرتب کیا ہے؟ انھوں نے نفی میں جواب دیا اور اپنی بے شمار کہانیوں کا ذکر جنھیں سلسلہ وار ٹیلی ویژن پر پیش کیا گیا جو کہ میرے موضوع میں شامل نہیں ہیں۔

پھر میں نے منظور الدین صاحب سے بات کی۔ موصوف نے کچھ وقت لیا اور دوبارہ خود ہی فون کر کے (37) ڈراموں کے نام لکھوائے جو میں نے یہاں درج کیے ہیں۔

1۔ بختاور 2۔ کھڑکی 3۔ نئے سال میں انسان کی آبرو 4۔ چڑھتی دھوپ اترتی دھوپ 5۔ آج کی بھاگ متی 6۔ صدفی صد 7۔ منزل 8۔ ضد 9۔ اجنبی ایک شہر میں 10۔ تیرا اجالا 11۔ آزمائش 12۔ کبود

13۔انجام بخیر 14۔گردش 15۔ٹیڑھی کھیر 16۔گردگمنام 17۔زہاب 18۔کل اور کل 19۔ایک مہینہ 20۔سنگدل 21۔ناک 22۔سونا مٹی 23۔نیلام 24۔کوئیل 25۔دولت کدہ 26۔تہمت 27۔یہ نہ تھی ہماری قسمت 28۔یہ دکھاوا 29۔دو دشمن 30۔ بازگشت 31۔عید مبارک 32۔قاتل 33۔جونک 34۔کرنیں 35۔دولت کدہ 36۔میرا دوست اور 37۔اندھیرا اجالا۔

میں نے یہ فہرست لکھ تو لی۔ پھر پوچھا کہ ”کیا یہ سارے ریڈیو ڈرامے ہیں۔؟“ کہا۔”ہاں،۔ پھر میں نے پوچھا۔”کیا یہ سارے AIR حیدرآباد سے نشر ہوئے ہیں؟“

”نہیں۔“انھوں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”قمرا میں ڈائرکٹر جنرل رہا۔ پہلے ریڈیو سے پھر ٹیلی ویژن سے جڑا رہا۔لہٰذا تقریباً سترہ مقامات پر (ہندوستان کے) پھرتا رہا اور جہاں جہاں میرا تبادلہ ہوا رفیعہ میرے ساتھ رہیں۔اس لیے یہ سارے ڈرامے جالندھر، کشمیر، شری نگر، پنجاب، دلّی اور نہ جانے کہاں کہاں سے ہیں۔اس لیے یہ سارے ڈرامے ہندوستان کے مختلف ریڈیو اسٹیشنوں سے نشر ہوتے رہے۔میں AIR حیدرآباد کی سند نہیں دے سکتا۔“

”کیا کوئی مجموعہ مرتب ہوا ہے؟“میں نے پوچھا

”نہیں۔لیکن اب کر رہا ہوں۔سب یکجا کر لیے ہیں۔اسی لیے تمھیں فہرست لکھ سکا۔“

”مگر۔میرا موضوع A.I.R حیدرآباد تک محدود ہے۔“میں نے کہا۔

انھوں نے معذرت کر لی اور کہا کہ ابھی وہ اس موقف میں نہیں ہیں۔ریکارڈز ڈھونڈ رہے ہیں۔انھیں یقین ہے کہ انشاء اللہ بہت جلد وہ سارا مواد دستاویزی شکل میں پیش کر سکیں گے۔رفیعہ باجی اب حیات نہیں رہیں۔اس لیے پچھلی یادوں کو مزید کرید کر میں انھیں مغموم نہیں کرنا چاہتی تھی۔منظور الامین صاحب، جنھوں نے تمام فعال عمر ذرائع ابلاغ میں گزاری، ان سے بات کر کے بہت کچھ حاصل کیا جا سکتا تھا، مگر ذکر ان کی محبوب رفیق حیات کا تھا جن کے بارے میں بات کرتے وہ تھک نہیں رہے تھے۔ہاں یہ ضرور کہا کہ وہ ٹی وی اور ریڈیو براڈ کاسٹنگ پر ہارڈ ویر اور سافٹ ویر کے ساتھ اردو میں ایک مبسوط کتاب لکھ رہے ہیں جس کے ساڑھے چار سو صفحے مکمل ہو چکے ہیں۔جب یہ کتاب بازار میں آئے گی تب ٹی وی اور ریڈیو کے بارے میں ایک بڑا سرمایہ ہوگی۔

(ٹیلی فون پر انٹرویو جناب منظور الامین صاحب شوہر محترمہ رفیعہ منظور الامین صاحبہ مرحومہ و مغفورہ 14 فروری 2014 صبح دس بجے)

میں نے پھر جعفر علی خان صاحب سے فون پر بات کی۔جناب جعفر علی خاں نے اپنی عملی زندگی کی شروعات ہی آل انڈیا ریڈیو، حیدرآباد سے کی اور وہیں سے وظیفۂ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے۔ان کی اچھی کارکردگی کی وجہ سے مابعد وظیفہ انھیں ملازمت میں توسیع کا موقع ملا اور آج بھی وہ اردو سیکشن کے (P.Ex) یعنی پروگرام ایکزیکیٹیو ہیں۔جعفر علی خان صاحب حیدرآباد میں ریڈیو ڈرامے کے زرین دور کے گواہ ہیں بلکہ اس ٹیم کا حصہ ہیں جنھوں نے حیدرآباد میں ریڈیو ڈرامے کے دور کو ”گولڈن ایرا“ کہلانے کا جواز بخشا۔

انٹرویو کے دوران میں نے ان سے حیدرآباد میں ریڈیو ڈرامہ نگار خواتین کے نام دریافت کیے۔انھوں نے بلا تاخیر و جھجک کہا۔

”خواتین میں صرف تین نام:

(1) محترمہ رفیعہ منظور الامین صاحبہ، (2) قمر جمالی اور کبھی کبھی جیلانی بانو صاحبہ

ویسے مردوں میں اچھے ڈرامے لکھنے والوں کی تعداد زیادہ ہے۔“

اپنے اس دور کی یادیں تازہ کرتے ہوئے انھوں نے کہا:

”1975 تا 1985 حیدرآباد ریڈیو (A.I.R)، ریڈیو ڈراموں کے حوالے سے زرین دور رہا ہے اور یہ دور تاریخ میں ہمیشہ محفوظ رہے گا۔“

(حوالہ: شخصی انٹرویو بذریعہ ٹیلی فون۔16 فروری بہ روز اتوار گیارہ بجے دن)

محولہ بالا حوالوں کے زیر اثر راقم الحروف یہ کہنے کے موقف ہے کہ ریڈیو ڈراموں اور ریڈیو فیچرز میں خواتین کی توجہ کم ہی رہی ہے۔مزید برآں نشری ڈراموں کا مجموعہ ’سنگریزے‘ 1933، مطبوعہ خورشید پریس، چھتہ بازار، حیدرآباد (آندھرا پردیش) راقم الحروف کا واحد مجموعہ ہے، کیونکہ کسی نے اپنے ڈراموں کو ابھی تک کتابی شکل نہیں دی۔’سنگریزے‘ میں صرف ڈرامے شامل ہیں۔ویسے کچھ اور ریڈیو ڈرامے اور ریڈیو فیچرز جو A.I.R حیدرآباد اور دہلی سے نشر ہو چکے ہیں جو کتابی شکل میں آنے کے منتظر ہیں۔

□□□

Qamar Jamali
H. No. 4-5 Himagiri Nagar Colony
Gandamguda
Hyderabad-500091 (Telangana)

ڈاکٹر مسرت جہاں

رضیہ سجاد ظہیر کے ناول 'اللہ میگھ دے' کی تہذیبی و عصری معنویت

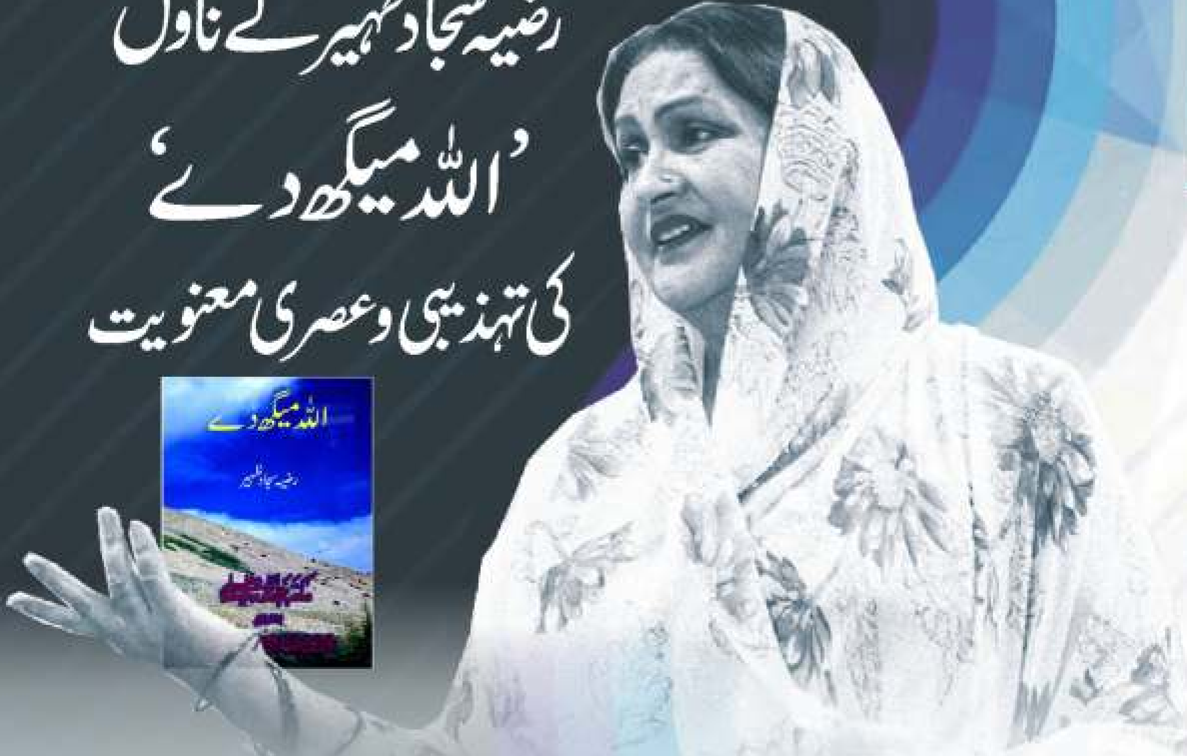

رضیہ سجاد ظہیر اُردو کی ایک معتبر فکشن نگار ہیں انھوں نے افسانوی ادب کے ساتھ ساتھ غیر افسانوی ادب میں بھی بہترین اضافہ کیا ہے۔ ''زرد گلاب'' اور ''اللہ دے بندہ لے'' میں افسانے کے علاوہ اچھی تعداد میں خاکے بھی موجود ہیں۔ وہ بحیثیت مترجم بھی اپنی ایک منفرد شناخت رکھتی ہیں۔ رضیہ سجاد ظہیر خوش مزاج، روشن خیال، ذہین، متحرک اور ترقی پسند نظریہ کی حامل رہی ہیں۔ ان کا اصل نام رضیہ دلشاد عرف مونا تھا۔ 1938 میں ترقی پسند ناقد سجاد ظہیر سے شادی ہوئی اور وہ رضیہ سجاد ظہیر بن گئیں۔ ان کا ادبی و تخلیقی سفر ہمیشہ جاری و ساری رہا۔

انھوں نے چار ناول تخلیق کیے جو بتدریج 'سرِ شام' 1953، 'کانٹے' 1954، 'سمن' 1963، اور 'اللہ میگھ دے' 1973 کے عنوان سے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کا ایک نامکمل ناول ''دیوانہ مر گیا'' ہے۔ ان کے ناولوں کے کردار ہم عصر معاشرے سے اخذ کیے گئے ہیں جو اپنی اچھائیوں اور برائیوں کے ساتھ سرگرم عمل نظر آتے ہیں۔ رضیہ سجاد ظہیر ان کرداروں کے شب و روز کے مسائل اور ان کی جدوجہد کی جزئیات بڑے موثر انداز میں پیش کرتی ہیں۔ ان کے ذہنی رویے اور فکری سطح کے مطابق وہ ان کرداروں کو فطری بنانے کی کامیاب کوشش کرتی ہیں۔ ان کے ناولوں میں ادبی تحریکات خصوصاً ترقی پسند تحریک سے کرداروں کی وابستگی نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے جو اپنی عملی زندگی میں معاشرے کو بہتر بنانے کے لیے کوشاں اور سرگرداں نظر آتے ہیں۔ ان کے ناول عملی زندگی کی منہ بولتی تصویریں ہیں۔ ان کے بیشتر کردار نوجوان ہیں جو وطن پرست ہیں کرداروں کے اعمال و افعال ان کی فکر مندی اور جذباتی وابستگی کو نمایاں کرتے ہیں جو اکثر و بیشتر کردار تعمیری کاموں میں لگے رہتے ہیں۔ رضیہ سجاد ظہیر کے ناولوں میں عموماً مرکزی کردار کا اختتام المیہ پر ہوتا ہے۔ ''اللہ میگھ دے'' میں نہال سنگھ، اپنے ملک بنگال کے لیے کچھ کر گزرنے کا جذبہ رکھنے والا مرکزی کردار منصور اور سمن وغیرہ ایسے کردار ہیں جن کی زندگی کی شام بہت جلد ہو جاتی ہے۔ مصنفہ نے ناولوں میں مزید دلچسپی پیدا کرنے کے لیے کرداروں کو فنون لطیفہ سے بھی جوڑے رکھا ہے۔ مصوری، موسیقی، سنگتراشی، شاعری وغیرہ سے کرداروں کی دلچسپی نمایاں طور پر پیش کی گئی

ہے۔

رضیہ سجاد ظہیر بالیدہ ذہن کی مالک تھیں۔ ان کا اپنا ایک مطمح نظر تھا۔ ان کا خواب ایک خوشحال معاشرے کا خواب تھا جہاں کے لوگ کھلے ذہن کے ہوں۔ انھیں اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ پورا سماج طبقاتی کشمکش کا شکار ہے جیسے کہ پورا معاشرہ دو حصوں میں بٹا ہوا ہے اور دونوں حصوں کے درمیان ایک خلیج ہے۔ وہ اس خلیج کو دور کرنا چاہتی تھیں۔ انھوں نے عملی طور پر بھی اپنی زندگی اس کے لیے وقف کر دی تھی اور اپنی کہانیوں میں بھی اسی نظریہ کا پیغام دیا ہے۔

''اللہ میگھ دے'' رضیہ سجاد ظہیر کا شاہکار ناول ہے۔ یہ دراصل لکھنؤ میں 1960 میں آئے ایک بھیانک سیلاب کا بیانیہ ہے جس میں بے تحاشہ تباہی و بربادی ہوئی۔ بے شمار جانیں تلف ہوئیں اور معاشی نقصانات بھی ہوئے۔ لیکن اس سیلاب جیسے آفت سماوی کے موقع پر وہاں کے لوگوں نے بلا تفریق مذہب و ملت پورے خلوص کے ساتھ امدادی کام کیے۔ لوگوں کو راحت پہنچائی اور کسی طرح کا امتیاز نہیں برتا۔ مصنفہ نے اس سیلاب کے ذریعے لکھنؤ کی اسی اتحاد و یگانگت والی تہذیب کو نمایاں کیا ہے۔ کہانی کے بیان کے دوران اُنھوں نے جابجا لکھنؤ اور پورے ملک کی تہذیبی، سماجی، معاشرتی اور سیاسی جھلکیاں بھی دکھائی ہیں۔

''اللہ میگھ دے'' کا محل وقوع لکھنؤ ہے۔ مصنفہ نے اس ناول میں لکھنؤ کی تہذیب و ثقافت کے نقوش پیش کیے ہیں۔ لکھنؤ اور یہاں کی تہذیب و ثقافت سے رضیہ سجاد ظہیر کو گہرا لگاؤ تھا۔ یہ ان کے لیے سجاد ظہیر کی سرزمین تھی جن سے وہ بے حد محبت کرتی تھیں۔ لکھنؤ کی تہذیب کی اپنی ایک تاریخ رہی ہے۔ یہ شہر نوابوں، رؤسا اور بلند پایہ ادیبوں کا مسکن و محور رہا ہے۔ یہ انتہائی، بارونق، دلفریب اور پرتکلف تہذیب کا مرکز ہے۔ یہاں کے نوابوں اور بادشاہوں نے ادب و فنون کی حوصلہ افزائی اور انسان دوستی کی ایسی مثالیں قائم کی ہیں کہ وہ تاریخ کا حصہ بن گئی ہیں۔ اُنھوں نے اس کی اتنی پائیدار بنیاد رکھی کہ اس کا استحکام آج بھی برقرار ہے۔ وہاں کا باشندہ اس روایت کی پاسداری کو اپنی شان سمجھتا ہے اور اس پر ناز بھی کرتا ہے۔ 'اللہ میگھ دے' اسی لکھنوی تہذیب و معاشرت کا عکس ہے۔ نیتا اور نریندر اس ناول کے دو اہم کردار ہیں۔ ان دونوں کی آپسی گفتگو ملاحظہ کیجیے:

''جب رکشہ وہاں سے گزر گیا تو نیتا بولی 'نریندر' ہمارے شہر کے لوگ بڑے ہی جیالے ہیں' اب دیکھو ان لوگوں نے دن بھر پتھر ڈھوئے ہوں گے' یہ سڑک بن رہی ہے نہ۔۔۔ اور اس وقت یہ گرمی دیکھو' یہ محنت اور تھکن اور کیسا ڈھول لیے گا رہے ہیں اور جبکہ بارش کی کوئی امید نہیں پھر بھی ان کے یہ آس بھرے گانے کیا اچھے لگتے ہیں'

نریندر بولا' کیا کہنا۔۔۔۔ دل والوں کا شہر ہے یہ لکھنؤ'۔''

(''اللہ میگھ دے'' صفحہ 14)

یہ احساس ناول کے ایک اور حصہ میں مزید شدت سے پیش کیا گیا ہے۔ ایک اقتباس دیکھیں:

''بندگی نواب صاحب۔ اب لکھنؤ میں بھی یہ بے مروتی ہونے لگی کہ آپ مجھے دیکھیں اور پیٹھ موڑ کر نکل جائیں۔''

(''اللہ میگھ دے'')

ناول کے دوسرے کردار نہال اور دیا بڑے ہی محنتی، پرجوش اور وطن پرست نوجوان ہیں۔ انھیں اپنے وطن کی تاریخ 'قدیم عمارتیں، محلات، نوابوں کے بنوائے ہوئے نادر فن تعمیر کے نمونے، یہاں کے باغات غرض یہ کہ ذرہ ذرہ سے لگاؤ ہے۔ نہال دیبا سے غدر کا تاریخی واقعہ یاد دلاتے ہوئے کہتا ہے:

''یہ تو جانتی ہو نہ کہ لکھنؤ نے آخر وقت تک ہتھیار نہیں ڈالے تھے اور انگریزوں کے مقابلے پر تھی لکھنؤ کی ایک عورت۔ بیگم حضرت محل۔''

''ہاں یہ مجھے معلوم ہے۔''

نہال ذرا جذباتی ہو گیا ''ہمیں اپنے شہر پر بڑا ناز ہے دیبا' یہ جیالوں' دل والوں کا شہر ہے' یہ عزت اور وقار والوں کا شہر ہے' یہاں کبھی فرقہ وارانہ فساد نہیں ہوا' یہ دوستوں' رفیقوں' وفاداروں کا شہر ہے'' (''اللہ میگھ دے'' صفحہ 100-99)

ادبی تاریخ کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ متعدد بلند پایہ شاعر و ادیب یہاں کے متوطن رہے۔ انھیں لکھنوی ہونے پر فخر تھا جسے وہ فخریہ اپنے نام کا حصہ بنایا کرتے تھے اور وہاں کی تہذیب کو پیش کرنا لازمی سمجھتے تھے۔ گلزار نسیم، فسانۂ عجائب، فسانۂ آزاد، امراؤ جان ادا اور شامِ اودھ وغیرہ ایسے ہی کارنامے ہیں۔ رضیہ سجاد ظہیر کا ناول ''اللہ میگھ دے'' بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ لکھنوی وضع قطع' لباس اور اشیائے خورد و نوش بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ کھانے کا ذکر ناول میں کئی جگہ موجود ہے۔ ایک مثال ملاحظہ کیجیے:

''چھوٹے پیالوں میں ایک ایک بوٹی اور ذرا سا شوربہ روٹی سے کھا رہے ہیں۔ چولھے کے مدھم اُپلوں پر چمکتی ہوئی

المونیم کی بڑی بڑی دیگچیوں میں سے بھاپ اُٹھ رہی ہے' اس کے پاس ہی تندور سے روٹیاں نکل رہی ہیں' بڑی بڑی ملائم' گدگدی آبی روٹیاں' تندوری پراٹھے پاس ہی لگے تندور میں سے نکل نکل کر میزوں پر جارہے ہیں۔ کھلی آگ پر کباب لپٹی ہوئی۔' فیکٹری کے بانبوں کی طرح گھوم رہی ہیں۔'' (''اللہ میگھ دے'' صفحہ 66)

کہیں گولا کباب' ادرک کے لچھے اور پانوں کا ذکر کر کے وہاں کی تہذیب پیش کی ہے۔

رضیہ سجاد ظہیر نے لکھنؤ کی عمارتوں، محلات، محلوں، چوراہوں، علاقوں، ندی اور مختلف آثار کے نام من و عن پیش کر دیے ہیں۔ یعنی ناول میں ان کے نام وہی رکھے ہیں جو اُن کے اصلی نام ہیں۔ لہٰذا حقیقتیں فسانے کے پیکر میں ڈھل گئی ہیں اور فسانے کو پڑھ کر غور کیجیے تو وہ سب اپنی حقیقی شکلوں میں موجود ہیں۔ یہ مصنفہ کا اہم کارنامہ ہے۔ مثالیں ملاحظہ فرمائیے:

''نہال سنگھ سنجیدگی کے ساتھ بولا۔۔۔' نواب صاحب' یہ جو سکندر باغ والا بند ہے' اس کو پانی سے بہت سخت خطرہ ہے۔''

(''اللہ میگھ دے'' صفحہ 39)

''وہ پیپرمل کے پیچھے والی لین میں پانی چلا گیا ہے نہ۔۔۔ تو وہاں سے کچھ لوگوں کو ہٹا کر فیض آباد روڈ پر ایک کیمپ لگایا گیا ہے۔''

(''اللہ میگھ دے'' صفحہ 41)

''موٹر بلواسیہ مارکیٹ کے سامنے سے ہوتی ہوئی حضرت گنج پار کرتی ہوئی نہر ہی کے نکڑ پر کافی ہاؤس کے سامنے رک گئی۔''

(''اللہ میگھ دے'' صفحہ 43)

''لکھنؤ یونیورسٹی کے ایک ہوسٹل میں مہندر کمرے میں سوہن پلنگ پر آڑا لیٹا تھا۔''

(''اللہ میگھ دے'' صفحہ 76)

''رکشا امین آباد سے کاٹھ کے پُل کی طرف جانے کے لیے' قیصر باغ بارہ دری کے سامنے سے ہوتا ہوا شاہ نجف روڈ پر آ گیا' اور پھر سکندر باغ کے سامنے سے مڑ کر کاغذ کے پُل کے نیچے پہنچ گیا۔۔ نہال نے اُسے پیسے دیے اور دیپا سے بولا 'آؤ'۔

'مگر تم مجھے یہاں کیوں لے آئے بھئی؟'

'تم آؤ تو'۔

دونوں جا کر بیچ پُل پر کھڑے رہے۔۔۔ دیپا بولی' اُفوہ' گومتی تو بہت بڑھ گئی ہے۔'' (''اللہ میگھ دے'' صفحہ 93)

اس کے علاوہ بھی رانی گنج، آئی ٹی چوراہا، آئی ٹی کالج، منکی برج، آرٹ کالج، حسین آباد، چھتر منزل، شاہ نجف، رضی حسن روڈ، سکندر باغ، حضرت گنج پارک، نشاط گنج، ٹیگور مارگ وغیرہ وہاں کے شناسا نام ہیں۔ اس طرح یہ ناول ایک حقیقت پسند نظریہ کی حامل فنکارہ کی حقیقی پیش کش بن جاتا ہے۔

کسی تخلیق کار کے فن کا تصور معاشرے اور عہد کے تذکرے کے بغیر ادھورا معلوم ہوتا ہے۔ ہر فنکار کا اپنے معاشرے اور عہد سے اٹوٹ رشتہ ہوتا ہے اور فن پارہ اپنے معاشرے کا عکاس ہوتا ہے۔ اس کے ذریعہ اس عہد کو جانچا اور پرکھا جاتا ہے۔ رضیہ سجاد ظہیر کے ناول میں بھی اس عہد کا معاشرہ سانس لیتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ لکھنؤ ادب و ثقافت کا گہوارہ اور اس سے دلچسپی رکھنے والوں کا مرکز رہا ہے۔ ادب دوست بادشاہوں کی ایک تاریخ رہی ہے جنھیں فن اور فنکاروں سے بھی خصوصی شغف رہا ہے۔ یہاں امام باڑوں اور مختلف عمارتوں کی شکل میں فن تعمیر کی عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔ فنون لطیفہ سے دلچسپی بادشاہوں کے ساتھ ساتھ یہاں کے عوام کی سرشت میں داخل ہے جس کی روایت آج تک چلی آ رہی ہے۔ ''اللہ میگھ دے'' میں بھی کئی ایسے کردار ہیں جنھیں اِن فنون سے دلچسپی ہے۔ ''اللہ میگھ دے'' کا ایک اہم کردار نیتا ہے جسے سنگتراشی کا شوق ہے۔ یہ سنگتراشی اس کی مجبوری نہیں بلکہ دلچسپی کا سامان ہے۔ جس سے وہ پورے انہماک سے جڑی ہوئی ہے۔ ایک اقتباس دیکھیے:

''انسان کا تخیل' پتھریلے راستوں سے سر ٹکراتا' اپنے لیے ایک منزل ڈھونڈ رہا تھا۔ آہستہ آہستہ' سامنے رکھے ہوئے اوبڑ کھابڑ' پتھر کے ٹکڑے میں سے ایک ننھے سے بچے کا تخیل' گلگھنا جسم ابھر رہا تھا۔'' (''اللہ میگھ دے'' صفحہ 08)

سنہا صاحب مضبوط کردار کی شکل میں ناول میں موجود ہیں جو پرانی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ زندہ دل اور حاضر جواب ہیں۔ انھیں آرٹ سے گہری دلچسپی ہے۔ یہ ان کی آمدنی کا ذریعہ نہیں ہے بلکہ وہ اسے اپنی تسکین کا ذریعہ تصور کرتے ہیں۔ ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''آرٹ کی طرف زیادہ مائل ہو گئے' مصوری اور سنگتراشی اور سنگیت کی کتابیں اکٹھی کرنے لگے' آرٹ کالج اور میوزک کالج کے لائف ممبر بنے' نمائشیں لگواتے' نوجوان

فنکاروں پر مضامین لکھتے۔ اُن کا دل بڑھاتے‘ اُن کی چیزیں بکواتے ۔۔۔ ریٹائر ہونے کے بعد بھی ہر وقت اُن کے یہاں نوجوان فنکاروں اور علم کے شوقین لڑکے لڑکیوں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔‘‘ (’’اللہ میگھ دے‘‘ صفحہ 51)

سنہا صاحب کے بھائی‘ نیتا کے والد جو ناول میں بظاہر ایک ضمنی کردار کی حیثیت سے تھوڑی دیر کے لیے آتے ہیں مگر وہ اپنی خوبصورت آواز اور آرٹ سے دلچسپی کے سبب ایک یادگار کردار بن گئے ہیں۔ سنہا صاحب‘ منوہر کے بارے میں بتاتے ہیں:

’’نیتا کے باپ کی آواز بڑی شاندار تھی‘ چھوٹی سی عمر سے اُسے سنگیت کا شوق تھا‘ رائے بریلی ضلع کے نوجوان ٹھاکر جے بہادر اور آصف الدولہ کے خاندان کے نوجوان نواب رضا حیدر صاحب‘ عرف چٹن صاحب اس کے خاص دوستوں میں تھے۔ منوہر سنہا کو سنگیت کا شوق تھا‘ جے بہادر کو شکار کا اور چٹن صاحب کو تیراکی کا۔‘‘ (’’اللہ میگھ دے‘‘ صفحہ 50)

مندرجہ بالا اقتباسات کسی نہ کسی ایک فرد کی دلچسپی پر محمول ہیں لیکن ہر فرد اپنی اپنی نسل کی نمائندگی کر رہا ہے اور اپنے کلچر سے پورے خلوص کے ساتھ وابستہ ہے۔ مصنفہ نے لکھنؤ کے ادبی ماحول کا بھی ذکر کیا ہے۔

’’میں نے کہا چلو سب کوئی بارہ دری چل رہے ہیں‘ فراق صاحب آئے ہوئے ہیں۔ مشاعرہ ہے تو کہنے لگا شعر تو میری سمجھ میں نہیں آتے ۔۔۔ کیسے پھر کیا سمجھ میں آتا ہے۔ کائستھوں کی اولاد‘ لکھنؤ کا رہنے والا‘ شعر نہیں سمجھتا۔‘‘

(’’اللہ میگھ دے‘‘ صفحہ 46)

اس اقتباس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ لکھنؤ میں رہنے والوں کا شعر نہ سمجھنا حیران کن تصور کیا جاتا ہے۔ یعنی اگر کوئی لکھنؤ کا باشندہ ہے تو یہ لازم ہے کہ وہ شعر فہم ہو۔

’اللہ میگھ دے‘ میں آزادیٔ ہند کے بعد کی سیاسی صورتحال کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ رضیہ سجاد ظہیر کے بیشتر ناول سیاسی پس منظر میں لکھے گئے ہیں۔ دراصل رضیہ از خود اس سے عملی طور پر جڑی ہوئی تھیں اور وہ سرتاپا ترقی پسند ادیبہ تھیں۔ اس سلسلے میں پروفیسر قمر رئیس لکھتے ہیں:

’’رضیہ آپا ۔۔۔۔ نے پریم چند کی عظیم روایت کو برقرار رکھا جس میں انسان دوستی ہے‘ عوام دوستی ہے‘ اس روایت کو اپنی کہانیوں میں انھوں نے ایک نئی جہت دی۔ لکھنا اُن کے لیے عبادت تھی‘ لکھ کر وہ اس عظیم جدوجہد میں شامل ہو جاتی تھیں‘ جن میں عوام اپنے حقوق کے لیے لڑ رہے تھے۔‘‘

(بحوالہ پروفیسر وہاب اشرفی۔ تاریخ ادب اُردو۔ جلد دوم۔ صفحہ 899)

رضیہ سجاد ظہیر کے فکر و فن اور اسلوب کے حوالے سے پروفیسر گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

’’ان کا رویہ زندگی کی طرف‘ سماج کی طرف‘ مذہب کی طرف ایک خاص طرح کا ہے۔ رضیہ آپا ان پر کھل کر طنز نہیں کرتی تھیں بلکہ ان کی طرف ہلکا سا اشارہ کرتی تھیں۔ یہ اشارہ پورے فنی احساس کے ساتھ ہوتا۔ زبان اُن کی نہایت ستھری اور نہایت کسی ہوئی تھی۔ وہ بہت چوکس کہانیاں لکھتی تھیں۔ رضیہ آپا کے یہاں چوٹ ہے انسان کی جہالت پر‘ توہمات پر‘ ان چوٹوں سے انسانی حسن کو نکھارنے کی کوشش کرتی تھیں۔ ان کی تحریریں بہت بڑا سرمایہ ہیں۔‘‘

(بحوالہ پروفیسر وہاب اشرفی۔ تاریخ ادب اُردو۔ جلد دوم۔ صفحہ 99-898)

رضیہ سجاد ظہیر نے جس زمانے میں لکھنا شروع کیا اس وقت ہر طرف ترقی پسندی کی ہوا گرم تھی۔ یہ بھی کھلے ذہن کی مالک تھیں لیکن اسے مزید استحکام بخشا سجاد ظہیر نے جو نہ صرف برصغیر بلکہ پوری اردو دنیا کے لیے جانا پہچانا نام تھا۔ وہ اس تحریک کے علمبردار تھے۔ رضیہ کو ان کے ساتھ نے مزید تقویت عطا کی۔ انھوں نے جس نظریہ کو اپنایا اس پر ہمیشہ قائم رہیں‘ اس کی حمایت کی اور اپنی کہانیوں کے ذریعہ اپنے نظریہ کو عام کرنے کی کوشش کی۔ مجموعی طور پر ان کے ناول کے کردار معاشرے کی فلاح و بہبود کے لیے عملی طور پر وابستہ دکھائی دیتے ہیں۔ ’’اللہ میگھ دے‘‘ میں دو نسلوں کا تصادم بھی موجود ہے۔ ملک کی آزادی کے لیے اور روشن مستقبل کے لیے جن لوگوں نے سخت محنت کی تھی‘ اپنے سرمائے تک کو ملک کے نام پر قربان کر دیا تھا تاکہ آنے والا وقت روشن اور تابناک ہو۔ ایک ایسے نظام کا قیام عمل میں آئے جس میں ہر طبقہ مطمئن ہو۔ سوشلزم عام ہو۔ ایسا نظام نہ ہو کہ معاشرہ میں طبقاتی کشمکش اور رسہ کشی ہو۔ سبھی کو برابری کا درجہ مل سکے۔ غرض یہ کہ معاشرہ میں انسانیت کا بول بالا رہے۔ لیکن ان کا خواب پورا نہ ہو سکا۔ ان کے بعد کی نسل جو ناول میں لکھنؤ یونیورسٹی کے طلبا و طالبات ہیں‘ ان سب نے ایک نئی مہم شروع کر دی ہے۔ اس مہم میں لڑکوں کے ساتھ لڑکیاں بھی شامل ہیں۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ لوگوں میں بیداری پیدا ہو رہی ہے لیکن پھر بھی ان کے سامنے صورتحال میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی اور اس کی وجہ وہ کھوکھلے نظام اور کمزور سیاست داں کو مانتی ہیں۔ ناول کا بنیادی موضوع بھی دراصل یہی ہے۔ اسی نظام پر مصنفہ کا

ایک طنز ملاحظہ کیجیے:

''کیا وجہ کہ کانپور کے مل مالک' آزاد ہندوستان کی آزاد حکومت کا جائز ٹیکس' کروڑوں روپیہ برسوں ادا نہ کریں اور پرائمری ٹیچر اگر پانچ روپیہ بڑھانے کے لیے بھی پرامن جلوس نکالیں تو ان پر یہ کہتے ہوئے لاٹھی چارج کیا جائے کہ آپ لوگ شانتی بھنگ کر رہے ہیں۔ اور غلامی کیا صرف غیر ملکیوں کی ہوتی ہے ماسٹر صاحب' ظلم اور استحصال کیا صرف غیر ملکی ہی کرتے ہیں۔ اگر اپنے بھی وہی کریں جو دوسرے کرتے تھے تب کیا کہیے گا؟ روس کا زار کون سا روسیوں کے لیے غیر ملکی تھا؟'' (''اللہ میگھ دے'' صفحہ 25)

''معاف کیجیے گا ماسٹر صاحب' میں آپ کی بات سے پورا اتفاق نہیں کر سکتا' جو صورت حال آپ نے بیان کی وہ بہت حد تک صحیح ہے مگر ایسا ہے کیوں؟ اسی لیے نہ کہ لوگوں کو صاف دکھائی دے رہا ہے کہ جو محنت نہیں کر رہے ہیں وہ ٹھاٹ کر رہے ہیں کیوں کہ وہ خوشامد کر رہے ہیں رشوت دے رہے ہیں' گٹھ بندیاں' سازشیں اور بلیک میل کر رہے ہیں۔۔۔ اور جو محنت کر رہے ہیں ان کا پسینہ دولت بن بن کر سرمایہ داروں کی تجوریوں میں اکٹھا ہو رہا ہے۔۔۔۔ گویا محنت کرنے والے بیوقوف ٹھہرے۔۔۔۔''

(''اللہ میگھ دے'' صفحہ 26)

ہندوستان کی آزادی اجتماعی کاوشوں اور محنتوں کا ثمرہ تھا۔ آزاد ہندوستان سے جمہوری نظام کی ابتدا ہوتی ہے اور یہ تصور کیا جاتا ہے کہ یہ نظام انسانیت کی بقا کا ضامن ہوگا۔ لیکن ایسا اس لیے ثابت نہیں ہو پاتا ہے کہ اندرونی طور پر کئی نظریے پنپنے لگے تھے۔

رضیہ سجاد ظہیر ترقی پسند خیالات کی حامل تھیں اور ان کے کردار بھی اسی نظریے کے تابع دکھائی دیتے ہیں۔ پہلی جنگ عظیم 1914 کے بعد جدوجہد آزادی میں مزید شدت پیدا ہوگئی۔ تعلیمی بیداری کے اثر سے آزادی اور حقوق انسانی کے معنی و مفاہیم مزید روشن ہونے لگے تھے۔ 1947 میں ہندوستان آزاد ہوگیا۔

رضیہ سجاد ظہیر کے اس ناول کا بنیادی موضوع سیلاب اور اس سے بربادی ہے۔ لیکن بنیادی طور پر اگر دیکھا جائے تو بیسویں صدی کی پوری سیاسی تاریخ' معاشرتی اور سماجی مسائل کا بیانیہ ہے۔ انھوں نے کرداروں کی مدد سے آزادی سے قبل اور اس کے بعد کی صورتحال کو بتدریج پیش کیا۔

مثالی وطن کے تصور میں جدوجہد آزادی میں حصہ لینے والے بہادروں، دانشوروں کی مثالیں دیں تاکہ قاری کے ذہن میں تمام کڑیاں جڑی رہیں:

''جب سب گولیاں چل چکیں' کئی انگریز سپاہی مر چکے اور نیچے بھی بہت سی گولیاں چلیں تو۔ جن میں سے ایک بھی اس کو نہیں لگی۔ تو اس نے اپنے پستول کی آخری گولی اپنی کنپٹی میں مار لی۔۔۔ اور نیچے آگرا۔۔۔ جب انگریز سپاہیوں نے لاش کو اٹھایا تو وہ حیران رہ گئے کیوں کہ وہ ایک عورت تھی۔''

''عورت ۔۔۔۔۔۔ نہیں' نہیں ۔۔۔۔۔ یہ صحیح نہیں ہو سکتا۔''

''یہ صحیح ہے'۔۔۔ اور میں جب بھی کسی پیڑ کو سیندور لگا دیکھتا ہوں تو مجھے یہ خیال آتا ہے کہ لکھنؤ کے لوگ پیڑ کو سیندور کیوں نہیں لگاتے۔۔۔ وہ جرات' ہمت اور وفا کے اس مندر کو بھول گئے دیا۔۔۔ جب ہمارے ملک میں سوشلزم ہوگا اور شہیدوں کی یادگاریں بنائی جائیں گی۔۔۔''

(''اللہ میگھ دے'' صفحہ 101-100)

ناول میں بیگم حضرت محل، گاندھی جی کا مثبت پیرائے میں ذکر اس بات کی دلیل ہے کہ ان کی بہادری اور ان کے نظریے قابل ستائش ہیں۔ لیکن ہر زمانے میں مختلف نظریات کے لوگ آتے رہے ہیں جو معاشرے کو اپنے نظریے سے دیکھتے ہیں اور ان کے پاس اس کی تائید میں ٹھوس دلائل بھی ہوتے ہیں۔ مصنفہ نے ان تمام نظریات کے حامل کرداروں سے کہانی کو آگے بڑھایا ہے تاکہ سیاسی منظر نامہ مکمل طور سے واضح ہو سکے۔ مثال کے طور پر ماسٹر صاحب کا یہ کہنا کہ:

''یونینیں تو مزدوروں کی بنا کرتی تھیں۔ اب علم کے میدان میں بھی بننے لگیں، ایمان کی بات تو یہ ہے کہ مجھے یہ بات پسند نہیں ہے۔۔۔''

(''اللہ میگھ دے''، صفحہ 23)

''۔۔۔سنا آپ نے! میں غدار ہوں۔ میں جس کا دادا غدر میں پھانسی پر چڑھا، جس کے باپ نے لکھنؤ یونیورسٹی کو بنایا، جس نے دو جوان بیٹوں کو جیتے جی صبر کیا مگر لکھنؤ چھوڑنے پر تیار نہیں ہوا۔'' (''اللہ میگھ دے''، صفحہ 61)

''ویسے تو وہ 1930 سے کانگریس میں شریک ہو گئے تھے۔ کھدر پہنتے تھے، کسانوں میں تقریریں کرتے تھے، جب گاندھی جی نے ڈانڈی مارچ کیا تو وہ بلیا سے ان کے ساتھ مارچ کرنے گئے تھے، قید ہوئے تھے۔۔۔

پھر دس بارہ سال تک کسانوں میں کام کرنے کے بعد 1942 میں جب 'ہندوستان چھوڑ دو' کا نعرہ دیا گیا تب تو انھوں نے اپنی تھوڑی بہت زمین، بیوی، بچہ سب تج دیا، کسانوں کے ایک جلوس کی رہبری کی، کچھ دن روپوش رہے، پھر گرفتار ہوئے۔ جیل میں بڑی سختیاں اٹھائیں، تقریباً سب کے بعد چھوڑے گئے ۔۔۔ جیل سے باہر نکلے تو پکے سوشلسٹ ہو چکے تھے۔۔۔'' (''اللہ میگھ دے''، صفحہ 67)

یہ خیالات ان لوگوں کے ہیں جو سچائی اور صداقت پر بھروسہ کرتے ہیں جو ایک بہتر قوم اور اس کی صحت مند روایت کے متمنی ہیں۔ لیکن ایک پورا طبقہ وہ بھی ہے جو ابن الوقت ہوتا ہے اور اسی طریقہ کو ترقی کا ضامن سمجھتا ہے۔

''اللہ میگھ دے'' ہمیشہ یاد کیا جانے والا ناول ہے۔ اسے مصنفہ کی ہنرمندی اور صنعت گری سے تعبیر کیا جانا چاہیے۔ انھوں نے 1960 کے سیلاب کو موضوع بحث بنایا ہے اور راحت کاری کے ذریعہ انسان کے جوش و جذبے کو بھرپور طریقے سے پیش کیا ہے۔ ''اللہ میگھ دے'' میں مصنفہ نے دو نکات کو خصوصی طور پر ابھارا ہے اور اس میں فنی چابکدستی سے کام لیا ہے۔

1۔ سماج کا ہر فرد برابر ہے اور صحت مند معاشرے کے لیے مساوات اور امن ضروری عناصر ہیں۔

2۔ کسی بڑے سانحے کے موقع پر لوگوں کو متحد ہونے اور ایک دوسرے کو سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔

1960 میں سیلاب ہی کو موضوع بنانے کی خاص وجہ یہ رہی کہ اس میں مذہب، ذات پات نیز امیر غریب کا فرق ختم سا ہو جاتا ہے۔ سبھی کا منشا یکساں رہتا ہے اور وہ کسی بھی طرح سیلاب زدگان کی مدد کرنا چاہتے ہیں۔ اس نکتے کے ذریعے رضیہ سجاد ظہیر نے ایک فضا بندی کر دی ہے جس کا مظاہرہ آج بھی اکثر و بیشتر ہوتا رہتا ہے۔ آج بھی جہاں کہیں راحت کاری کی ضرورت محسوس ہوتی ہے انسانیت جاگ اٹھتی ہے۔ کبھی بھی کوئی بڑی آفت آئے، کیرلا میں سیلاب آئے، اتراکھنڈ میں زلزلہ اور طوفانی بارش کی تباہ کاری ہو یا امرتسر کا حالیہ ریل حادثہ ہو جس میں دسہرہ تہوار کے درجنوں شائقین پلک جھپکتے ہی لقمۂ اجل بن گئے۔ ہر جگہ لوگ امدادی کاموں کے لیے دل و جان سے لگ جاتے ہیں۔ چندہ اکٹھا کرنا، گھروں سے اناج، کپڑے، دوا، غذا، سرکاری ملازمین کی ایک دن کی تنخواہ غرض یہ کہ چہار سُو سے ہر طرح کی امدادی کاوشیں کی جاتی ہیں اور یہ بات بھی بلا تردد کہی جا سکتی ہے کہ نوجوان طبقہ اس میں خاص طور سے پیش پیش رہتا ہے۔ جس طرح ''اللہ میگھ دے'' میں نہال سنگھ، دیبا، بوس، امتیاز، نریندر وغیرہ سرگرم تھے۔ رضیہ سجاد ظہیر کے یہ کردار آج بھی معاشرے میں موجود ہیں اور عصر حاضر میں اپنی معنویت کا احساس دلاتے ہیں۔

اللہ میگھ دے میں جو سیاسی منظر نامہ پیش کیا گیا ہے اور سیاست کی جن چالاکیوں اور موقع پرستی کی طرف اشارے کیے گئے ہیں وہ آج بھی ہمارے سماج اور معاشرے کا حصہ ہیں بلکہ صورتحال مزید شدید اور کریہہ ہو گئی ہے۔

'اللہ میگھ دے' کی تہذیبی و عصری معنویت آج بھی برقرار ہے۔

□□□

Dr. Mosarrat Jahan
Assistant Professor
Department of Urdu,MANUU
Gachibowli
Hyderabad - 500 032 (Telangana)

ڈاکٹر غضنفر اقبال

اردو افسانے کا تانیثی تناظر

عورت نے اپنے وجود سے تصویر کائنات کو رنگ دار بنا دیا۔ اسی کے ساز سے زندگی کے سوزِ دروں نے نقش ہزار رنگ کو جنم دیا۔ آدم کی ٹیڑھی پسلی سے پیدا ہونے والی عورت نے آدم زادوں کو آنکھیں دکھائیں۔ مردانہ حاکمیت کو عورت نے چیلنج کیا۔ مغرب کی خواتین ادیباؤں نے مرد حاکم معاشرے کو طبقۂ اناث کی تحریک ''تانیثیت'' سے روشناس کروایا۔ یہ تحریک خواتین کی مرہون قلم ہے۔ عورت کا احتجاج عورت کے قلم سے ہوا۔ معاشرتی فوقیت نے پوری دنیا کو بے طرح متاثر کیا۔ خواتین نے اپنے ماتھے کے آنچل کو ایک پرچم کی شکل میں لہرا کر مردوں کے ہاتھوں عورت کے استحصال، ظلم، نابرابری، بے حسی، سفاکی اور بے انصافی سے نجات دلانے کی ناتمام سعی کی۔

سرمایہ دارانہ نظام کی پیداوار تانیثیت نے عورت کو اس روشن خیال تحریک کے زیر اثر مرد کی سفاکیوں کی داستان رقم کرنے پر مجبور کیا اور خواتین کے مسائل پر خواتین کے ذریعے تخلیق کیے گئے ادب کو تانیثی ادب کہا جانے لگا۔ یہ تحریک خواتین کو مرد کے برابر دیکھنے کے علاوہ مرد اور عورت کی اجتماعیت میں تفریق پیدا کرنا چاہتی ہے۔ بنت حوا نے مرد حاوی سماج میں احتجاجی فضا سے معاشرے کو مکدر کر دیا۔ وہ مرد کے سنگ دلانہ رویوں، مظلومیت اور اس کی حاکمیت سے گلو خلاصی کی آرزو مند ہے اور اس نے تانیثی مخاطب قائم کر دیا۔ خواتین کے قلم سے نکلنے والے حرف و لفظ اب تانیثی تحریر کا روپ دھار چکے ہیں۔ کیونکہ عہد موجود کی عورت مرد غالب معاشرے میں اپنے وجود کو جھلستے ہوئے محسوس کر رہی ہے اور ایک گھٹن کا احساس حوا کی بیٹی کو زیادہ ہو گیا ہے۔ مغرب کی صورت حال سے مشرق مختلف ہے۔ یہاں کی خواتین قلم کار نے اپنی تقدیس، حرمت اور عظمت کا پاس رکھا ہے۔ اگرچہ ان کی تحریروں میں خواتین کے مسائل بیان ہوئے ہیں۔ مغرب کی آزاد خیال ادیباؤں نے تانیثیت کا شوشہ چھوڑ کر فرزند آدم پر محکومیت کا اعلان کر دیا۔ لیکن اس کے برعکس دختران مشرق نے تانیثیت کی تحریک نما تھیوری افکار، شعور اور ادراک کی سطح پر اس کے اثر کو قبول نہیں کیا۔ لیکن گھر آنگن سے نکل کر نئے موضوعات کی پرورش ضرور کی ہے۔ تانیثیت کے اثرات اردو ادب میں نظر آتے ہیں لیکن باہمی سطح پر کوئی تال میل ان میں نہیں ہے۔ مگر حیرت و مسرت کی فضا ان کے قلم فرسائی میں دکھائی دیتی ہے۔ جوگندر پال نے لکھا ہے:

> ''مشرقی خواتین کا دائرہ واردات آج بھی بالعموم گھر آنگن یا وہاں سے نکل کر اڑوس پڑوس تک محدود رہا ہے لیکن ادھر دو چار دہوں میں زندگی میں اتنی بوکھلا دینے والی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں کہ دادی اماں اگر اچانک قبر سے اٹھ کر گھر لوٹ آئے تو اپنی پوتیوں اور نواسیوں کو پٹ پٹ دیکھتی رہ جائے کہ یہ آخر ہیں کون؟''

(بحوالہ: پیش لفظ۔ جوگندر پال، کتاب سحاب، قمر جمالی، ص:5)

اس تحریر میں چند خواتین افسانہ نگاروں کے افسانے پر طائرانہ نظر ڈالنے کی سعی کی جائے گی۔ ڈاکٹر شائستہ فاخری کا افسانہ ''سات گوئیاں'' تانیثی حسیت کا افسانہ ہے۔ سات گوئیاں یعنی سات سہیلیوں کی نفسیاتی

گا تھا افسانہ نگار نے ان کے مسائل کے ساتھ بیان کی ہے۔ 'سات گوئیاں' یہ افسانہ خواتین کے ان مسائل سے بھی پردہ اٹھاتا ہے جس کو عام قاری نے کبھی اپنی سوچ کا حصہ نہیں بنایا تھا۔ عورت کی ایک عمر ہونے پر مسائل جسمانی اور ذہنی طور پر کیا ہوتے ہیں افسانہ نگار نے بین السطور میں کچھ اور راست کچھ کہہ کر اس موضوع کو دوچند کر دیا ہے:

"ہم سبھی گوئیاں اب پچاس پار کر چکی تھیں۔ اس عمر میں عورتیں بیاہی ہوں یا بن بیاہی، سب کی کہانی ایک جیسی ہوتی ہے۔ خاص طور سے ورکنگ خاتون کی۔ اپنی چڑچڑے پن کو، اپنے بناؤ سنگھار، اپنے لباس اور اپنے جدید ہیئر اسٹائل سے اپنی طرف آتی ہوئی جیسے بڑھتی عمر کے حملے کو اپنے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلی کے دھکے سے پیچھے دھکیلی ہوئی سب کچھ ٹھیک ہونے کے سوانگ کو بہ خوبی نبھانے میں مہارت رکھتی ہیں۔ ایک طرف جسم کی تراوٹ سوکھ رہی ہوتی ہے تو دوسری طرف چہرہ اپنا 'نمک' گرا کر خشک ریت کا پاؤڈر سیٹ رہا ہوتا ہے۔ بستر پر جانے سے پہلے ہم عورتیں چاہے کتنا ہی رگڑ رگڑ کر چہرے پر کریم کا مساج کرلیں مگر صبح جب اپنے کام پر نکلنے سے پہلے آئینہ کے سامنے کھڑی ہوتی ہیں تو دل ڈوبنے لگتا ہے۔"

(بحوالہ: افسانہ 'سات گوئیاں'، ڈاکٹر شائستہ فاخری، ص:29 ماہنامہ آج کل، نئی دہلی، اپریل 2017)

قمر جمالی کا افسانہ "اُپج" تانیثی ادراک کی سمتوں کا افسانہ ہے۔ یہ افسانہ بے سہارا، بے بس اور حالات سے مجبور عورت کی فریاد رسی ہے۔ اس افسانے کی عورتوں کو چاروں طرف مرد نما حیوان نظر آتے ہیں اور وہ اعتماد کی شکست سے جنم لیتی ہے۔ وہ عزم کرتی ہے کہ بھیڑیوں کے درمیان بھیڑیاں بن کے ہی جیا جائے تا کہ اجالوں سے پہلے ہمیں اندھیروں میں اپنے نشان ثبت کرنے میں آسانی ہو پیار کی زمین سے پیار کی اُپج ہو سکے:

"ٹھوکریں کھانا تو اس کا مقدر بن گیا تھا، اور اسے مقدر سے کوئی گلہ بھی نہیں تھا۔ کیونکہ اس کا ایقان تھا کہ ٹھوکریں انسان کے لیے انسان بننے کا جواز پیدا کرتی ہیں۔ ٹھوکریں اس نے خوب کھائی تھیں مگر آج جو ٹھوکر اسے لگی وہ اتنی شدید تھی کہ اس کے باعث اُس کے پاؤں کا انگوٹھا صرف آدھا رہ گیا تھا۔ وہ اپنے لہولہان انگوٹھے کو دیکھنا چاہتی تھی۔ مگر دیکھ نہیں سکتی تھی۔ اس سے زیادہ انسان کی اور کیا مجبوری ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے زخم کو نظر بھر کر دیکھ بھی نہ سکے۔"

(بحوالہ: افسانہ: اُپج قمر جمالی، کتاب سحاب، قمر جمالی، ص:10)

ڈاکٹر صادقہ نواب سحر نے افسانہ "سلگتی راکھ" کو عورت کی حیات کے ایک اہم موڑ عشق یا شادی پر اس کی بنیاد رکھی ہے۔ یہ افسانہ تانیثی شعور اور نفسیات کے کئی زاویے پیش کرتا ہے۔ عورت اپنی محبت کے لیے بھی مجبور ہے۔ وہ کسی کو دل آسانی سے نہیں دے سکتی۔ افسانہ نگار نے افسانے میں عورت کو اپنے ہی جذبوں کی ماری ہوئی عورت بتایا ہے مگر عورت کے تئیں مرد کے یہ جذبات دیکھیے:

"موہنی اب بھی جی چاہتا ہے تمھیں موہن کہوں۔ تم مجھے ہوس کا پتلا سمجھتی ہوگی۔ میں صفائی پیش کروں گا بھی نہیں شاید ہوس کے پجاری ہی کنواری لڑکیوں کو ماں بنا دیتے ہیں۔ میں نے سوچا تھا تم مجھ سے بدلہ لینا چاہو گی مگر تم تو دیوی ہو دیوی...... میں ایک گنہگار ہوں۔ تمھارے چرنوں میں شما کی بھیک مانگتا ہوں تمھارا دل بڑا ہے۔"

(بحوالہ: افسانہ: سلگتی راکھ، ڈاکٹر صادقہ، کتاب 'خلش بے نام سی' صادقہ نواب سحر، ص:46)

سمیرا حیدر نے افسانہ 'پل صراط' کو فساد کا منظر عطا کرتے ہوئے عورت کے اس کرب و بلا کو پیش کیا ہے جس میں عورت اپنی عزت، عفت اور عصمت کو تمام کر دیتی ہے۔ فسادیوں سے پیچھا چھڑانے کے لیے مظلومیت کا شکار ایک خانقاہ میں پناہ کی غرض سے داخل ہو جاتی ہے۔ افسانے کی آخری سطریں دیکھیے:

"اپنے آپ کو اسی خانقاہ میں پڑا ہوا پایا۔ آنکھیں کھولنے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ پلکیں میرے ہی ماتھے سے بہنے والے خون سے چپک چکی ہیں۔ بڑی جانکاہی سے آنکھ کھولی تو دیکھا سامنے ایک سبز پوش آدمی کھڑا تھا۔ حق، حق، حق کی مسلسل گردان کرتا ہوا۔

اس کے ہاتھ میں مورچھل تھا وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا میرے نزدیک آتا گیا اور اس مورچھل سے اس نے میرے چہرے کو مس کیا اور ساتھ کوئی دعا پڑھنے لگا۔ اس لمحے یہ سوچ کر اپنی آنکھیں پھر سے بند کرلیں کہ شاید یہی میری آخری منزل ہے اور یہ فقیر یا قلندر مجھے میرے پل صراط پر لے جائے۔ شاید...... شاید"

(بحوالہ: افسانہ: 'پل صراط' سمیرا حیدر، کتاب دل مضطرب، سمیرا حیدر، ص:106)

ڈاکٹر کوثر پروین کا افسانہ "روپ بہروپ" ایک دوہرے معیار کو اپنانے والی خاتون کی کہانی ہے۔ 'یوم خواتین' کے جلسے کی صدارت اس

خاتون کو کرنی ہے جس کا مزاج تلخ ہے۔ خواتین کی حمایت میں بات کرنا اور عملی زندگی میں اس بات کی نفی اس خاتون کا کردار ہے۔ افسانہ نگار نے اس کے کردار کو بڑے سلیقے اور احسن انداز میں پیش کیا ہے:

"عورت کا درد رکھنے والی یہ صدر جب بولتی تو لگتا اس کا ایک لفظ لفظ عورت کی آزادی و مساوات اور اس کی ترقی کے لیے برقرار ہے۔ وہ بہت بول رہی تھی۔ عورت ہی عورت کی دشمن ہے۔ عورت ماں کی حیثیت سے بیٹی کی تائید کرتی اور بہو کو تنگ۔ وہ ساس کے روپ میں ماں کیوں نہیں بنتی۔ ایسا ہو تو بہو، بیٹیاں نہیں جلائی جائیں گی۔ عورت کی بہتری کے لیے عورت ہی کو بڑھ کر کام کرنا چاہیے۔"

(بحوالہ: افسانہ روپ بہروپ: کوثر پروین کتاب دل، کوثر پروین، ص:47)

بالائی سطور میں راقم التحریر نے چند افسانوں کا جائزہ تانیثی تناظر میں پیش کرنے کی ناتمام کوشش کی ہے۔ تانیثی نظریہ مشرقی اور اردو خاتون افسانہ نگاروں کے ہاں ہنوز قدم رنجہ نہیں ہو پایا ہے۔ آہستہ آہستہ تانیثیت افکار اور ذہن کو خواتین افسانہ نگار قبول کرتے ہوئے نظر آتی ہیں۔ کیونکہ مرد اساس معاشرے میں اردو افسانہ کی تانیثی طرز فکر ابھی مستور ہے۔ پردہ اٹھنے کے انتظار میں نگاہیں تانیثی مکالمے کے سین کو غور سے دیکھ رہی ہیں اور ادا جعفری مرحومہ کی آواز میں سرگوشی کر رہی ہیں:

میں آندھیوں کے پاس تلاشِ صبا میں ہوں
تم مجھ سے پوچھتے ہو مرا حوصلہ ہے کیا

Dr. Ghazanfar Iqbal
"SAIBAN" Zubair Colony
Hagarga Cross, Ring Road
Gulbarga-585104 (K.S)

Subscription Form "Mahnama Khwateen Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'ماہنامہ خواتین دنیا' کا رکن سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر.............................. بتاریخ..............................

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِ تعاون سالانہ -/100 روپے IFSC: SYNB0009009، A/C: 90092010045326 میں جمع کروا دیا ہے۔

آپ 'ماہنامہ خواتین دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.:sales@ncpul.in

دستخط

جدید اردو افسانہ اور خواتین افسانہ نگار

کنیز فاطمہ

داستان، ناول، افسانہ نثری صنف کے مختلف روپ ہیں۔ ان تینوں کو ملا کر فکشن کا نام دیا جاتا ہے۔ کہانی پن یا قصہ پن فکشن کی جان ہے۔ جب انسان کو فرصت تھی تب وہ طویل قصے سننا پسند کرتا تھا مگر مصروفیت بڑھنے کی وجہ سے افسانہ وجود میں آیا جس کا زندگی کے کسی ایک رخ یا کردار کے کسی ایک پہلو سے سروکار ہوتا ہے۔

اردو افسانہ اردو نثر کی جدید ترین شکل ہے۔ ناول کی طرح افسانہ بھی مغربی ادب کی دین ہے۔ اردو کا پہلا افسانہ کون ہے اس کے بارے میں اختلاف ہے مگر اردو میں باقاعدہ طور پر افسانہ نگاری کا آغاز پریم چند سے ہوا جنھوں نے اردو میں پہلی بار عوامی زندگی کا سچا نقشہ کھینچا۔ گاؤں، کھیت کھلیان، مزدور کسان جیسے موضوعات کو اپنے افسانوں میں جگہ دی۔ وحدت تاثر افسانے کی روح ہے جس سے افسانہ نگار اپنے تخیل، مشاہدات اور تجربات سے کم سے کم وقت میں قاری کے ذہن پر زیادہ اثر چھوڑ جاتا ہے تجسس اور جدت و ندرت قاری کو اپنی گرفت میں لیتے ہیں اور وہی افسانے کی کامیابی کا راز ہے۔ افسانے میں اختصار و ہم آہنگی کے ساتھ بیان کی اصلیت بھی ضروری ہے۔

افسانے کے ابتدائی دور کے ادیبوں نے افسانہ نگاری میں اہم خدمات انجام دی جن میں سجاد حیدر یلدرم، راشد الخیری، مجنوں گورکھپوری، علی عباس حسینی، سہیل عظیم آبادی، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، حیات اللہ انصاری، غلام عباس، حسن عسکری، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، قاضی عبدالستار وغیرہ ہیں۔ وقت نے ایسے افسانے لکھنے کا مطالبہ کیا جس میں ایجاز و اختصار ہو۔ ابتدائی مرحلوں سے گزرتے ہوئے جدیدیت کے زیر اثر نئے تجربے کیے گئے۔ افسانہ نگار اپنے افسانوں میں علامتی اور استعاراتی طرز کے افسانے لکھنے لگے۔ علامتی افسانہ نگاری نے اردو افسانہ نگاری کو نئی جہت سے آشنا کیا۔ ان افسانوں میں تنہائی، بے بسی، بے یقینی، ذات کی گمشدگی، عدم تحفظ، اور تنہائی جیسے موضوعات جگہ پانے لگے۔ اردو افسانہ ہر عہد اور ہر زمانے کی حقیقتوں کی عکاسی کرتا رہا ہے۔ جدید افسانہ نگاروں میں ذکیہ مشہدی، ترنم ریاض، زاہدہ حنا، آمنہ ابوالحسن، ہاجرہ مسرور، بانو قدسیہ، ممتاز شیریں، واجدہ تبسم، قرۃ العین حیدر، خدیجہ مستور، جیلانی بانو، خالدہ حسین، نگار عظیم، صغرا مہدی، شمیم نکہت، سلمٰی صدیقی وغیرہ ہیں۔

افسانہ ایک ایسی صنف ادب ہے جس کی ابھی کوئی جامع اور مکمل تعریف متعین نہیں ہوئی ہے مگر افسانوں کا مطالعہ کرنے سے اس کے کچھ اجزاء افسانے میں نمایاں ہوتے ہیں جیسے:

کہانی پن: کہانی کہنا ہی افسانے کا فن ہے۔ کہانی وہ صنف ہے جس کے ذریعہ افسانہ آگے بڑھتا ہے وہی کہانی پن ہوتا ہے۔ کہانی ایک سلسلے کا نام ہے جس میں زمانی، تاثراتی ربط پایا جاتا ہے جو ایک کردار کے مختلف صورت حال سے دوچار ہونے یا کئی کرداروں کی الگ الگ صورت حال سے دوچار ہونے سے پیدا ہوتا ہے۔ جدید دور میں بہت سی ایسی کہانیاں لکھی گئیں جن میں کہانی پن موجود نہیں ہے۔ جدید دور کے جن

افسانوں میں کہانی پن موجود بھی ہے تو اس انداز سے نہیں ہے جیسا کہ پریم چند یا ترقی پسند افسانہ نگاروں کے یہاں پایا جاتا ہے۔ افسانوں میں کہانی پن کے متعلق پروفیسر طارق چھتاری کی رائے اہم ہے۔

"افسانے کا فن بنیادی طور پر کہانی کہنے کا فن ہے۔ اگر کسی افسانے میں "کہانی پن" نہیں ہے تو وہ افسانہ مضمون، انشائیہ یا محض نثر کا ایک ٹکڑا ہی معلوم ہوگا.......... کسی افسانے میں کہانی پن ہے یا نہیں، اسے پرکھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ جب کوئی کہانی پڑھ چکے تو اس افسانے کی کہانی زبانی سنانے کو کہا جائے، اگر اس میں کہانی پن ہوگا تو خواہ کیسی بھی تجریدی کہانی کیوں نہ ہو اور واقعات کو کتنا ہی توڑ مروڑ کر یا ان کی ترتیب بگاڑ کر کیوں نہ پیش کیا گیا ہو، زبانی بیان کرتے وقت سنانے والا لاشعوری طور پر اپنے حساب سے واقعات کو ترتیب دے کر کہانی سنا دے گا۔"

(جدید اردو افسانہ، ہندی، طارق چھتاری، ایڈیشن 2015، جے کے آفسیٹ، دہلی، ص121-122)

کردار: کردار یا کردار نگاری افسانے کا اہم پہلو ہے۔ اس کے بغیر افسانے کی عمارت کھڑی نہیں ہوسکتی۔ کردار کی کئی قسمیں ہیں۔ جدید افسانوں میں کردار کوئی شئے، مرئی اور غیر مرئی شئے بھی ہوسکتی ہے جو افسانوں میں بحیثیت کردار انسان کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔ پہلے افسانوں کے کرداروں میں یا تو اچھائی کا یا برائی کا ہنر دکھاتے تھے مگر جدید افسانوں میں دونوں طرح کے کردار دیکھے جاسکتے ہیں اچھے بھی اور برے بھی۔ اگر کوئی ادیب کرداروں کے باطن تک رسائی حاصل کرنے میں قاصر ہے تو اس کے افسانے کی کہانی اکہری اور سطحی ہو کر رہ جاتی ہے۔

جزئیات: ابتدائی دور کے افسانوں میں جزئیات ماحول اور فضا کو پیش کرنے کا مقصد قاری کو لطف اندوز کرنا تھا جس کو جدید افسانہ نگاروں نے روایتی اور فرسودہ مان کر اپنے افسانوں سے خارج کر دیا۔ بہت زیادہ جزئیات نگاری کی زیادتی افسانوں میں قاری کی اکتاہٹ کا سبب بنتی تھی اور آج جزئیات کی کمی نے اکثر قاری کو ایک طرح کی ذہنی الجھن اور بے چینی میں مبتلا کر دیا ہے۔ مگر پھر جدید افسانہ نگاروں نے جزئیات کی اہمیت کو محسوس کیا اور جدید افسانوں میں ایسی اشیاء کا انتخاب کیا۔ جو کہانی کے مرکزی خیال کو ابھارنے میں مددگار ثابت ہوں۔

حقیقت نگاری: یہ بھی افسانہ کا اہم جزو ہے۔ حقیقت نگاری کے دو پہلو ہیں (1) خارجی حقیقت نگاری (2) داخلی حقیقت نگاری۔

خارجی حقیقت نگاری میں سیاسی، سماجی اور جنسی حقیقت نگاری آتی ہے۔ پریم چند حقیقت نگاری کے علمبردار تھے مگر ان کے افسانوں میں خارجی حقیقت نگاری کے نقوش ملتے ہیں۔ ابتدائی زمانہ طے کرتے ہوئے افسانے میں تبدیلیاں رونما ہوئیں اور خارجی کے بجائے داخلی مسائل کا رجحان عام ہوا۔ آج جدید دور کے افسانوں کی حقیقت نگاری کو ہم داخلی حقیقت نگاری کہہ سکتے ہیں۔ اس میں تنہائی کا کرب، ذات کا مسئلہ اور وجود کے کھونے کا احساس جیسے موضوعات کہانی میں پائے جاتے ہیں۔ جدید افسانوں کے کردار نفسیاتی پیچیدگیوں، ذہنی الجھنوں اور اس کی نقل و حرکت کی وجوہات تلاش کر کے اصل حقیقت کا پتہ لگاتے ہیں اور اس حقیقت کا بیان استعاراتی اور علامتی انداز میں کرتے ہیں۔

لاشعوری خیالات کی تصدیق: جدید افسانوں میں لاشعوری خیالات کی تصدیق پر خاص توجہ دی گئی۔ خیالات دو قسم کے ہوتے ہیں شعوری اور لاشعوری۔ جو خیالات شعوری طور پر قاری کے ذہن میں واضح ہوتے ہیں جس کا وہ وقتاً فوقتاً اظہار بھی کرتا ہے شعوری خیالات کہلاتے ہیں۔ وہ خیالات جس کا واضح علم انسان کو نہیں ہوتا اور اس خیالات کو الفاظ کا جامہ پہنانے میں قاصر ہے وہ لاشعوری خیالات کہلاتے ہیں۔

قاری اور کردار کے مابین رشتہ قائم کرنا جدید افسانے کی دین ہے۔ اگر کوئی افسانہ نگار اپنی تخلیق کے ذریعہ قاری کے ذہن کی تہہ میں پہنچ کر اس کے لاشعور میں چھپے خیالات کی تصدیق کر لیتا ہے جو قاری کے شعور میں نہیں ہوتی ہے اور قاری اس کردار کے خیالات کو اپنا خیال تسلیم کر لیتا ہے تو افسانہ نگار اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

اسلوب: جدید افسانوں میں طرز تحریر کی عموماً تین قسمیں ہیں

(1) بیانیہ اسلوب

(2) تجریدی اسلوب

(3) منظری اسلوب (بصری)

عام خیال یہ ہے کہ جدید دور میں بیانیہ اسلوب فرسودہ اور پرانا ہونے کے سبب بیانیہ کہانیہ لکھنے کا رواج ختم ہوگیا ہے مگر ایسا نہیں ہے۔ کامیاب اور علامتی افسانے بھی بیانیہ اسلوب میں لکھے گئے ہیں۔ صرف سپاٹ اور اکہرے افسانے ہی بیانیہ کے زمرے میں نہیں رکھے جاسکتے اور نہ ہی یہ ضروری ہے کہ علامتی کہانی لکھنے کے دوران ہی تجریدی اسلوب اپنایا جائے۔ بلراج مین را کا افسانہ "وہ" بیانیہ اسلوب کی مثال ہے۔

جدید اردو افسانوں میں تجریدی اسلوب پر بہت زور دیا گیا۔ تجریدی کہانی لکھنے کا رواج عام تو ہوا مگر یہ قارئین میں خاص دلچسپی پیدا

نہیں کر پائے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''1960 کے بعد تجریدی کہانی کا رواج عام ہو گیا۔ انور سجاد، بلراج مین را، سریندر پرکاش، احمد ہمیش، انور عظیم وغیرہ کے علاوہ بہت سے کہانی کار تجریدی کہانیاں لکھ رہے تھے لیکن تجریدی کہانی قارئین میں دلچسپی پیدا نہیں کر سکی۔''

(ایضاً، ص 140)

منظری اسلوب: منظری اسلوب کا مقصد کہانی کو پیش کرنا ہے یعنی افسانہ نگار اس طرح اس کا عکس ابھارے کہ وہ کہانی قاری کو گزرتی ہوئی محسوس ہو۔ منظری اسلوب کا تعلق منظر نگاری سے نہیں بلکہ سنیما اور رنگین ٹیلی ویژن سے ہے۔ پہلے قاری کہانی پڑھ کر یا سن کر خود اس کا منظر اپنے ذہن میں بنا لیتا تھا مگر اب افسانہ نگار منظری اسلوب کے ذریعہ کردار کی ذہنی کیفیت و داخلی حالت کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ واقعہ ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر منظری اسلوب میں ''اس نے سوچا''، ''اس کی خواہش ہوئی'' جیسے بیانات کا نہیں بلکہ ''اس کی خواہش تھی'' جیسے بیانات لکھے جاتے ہیں۔

وجہ کی تلاش: جب دنیاوی خواب و خیال کا دور ختم ہوا تب افسانہ نگاروں نے اپنے اردگرد پھیلے بے شمار سماجی مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ ترقی پسند ادیبوں نے بھی سماج کے اچھے برے پہلوؤں کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا اور ان مسائل کو قارئین کے سامنے پیش کیا مگر جدید دور کے افسانہ نگاروں نے صرف مسائل کو قارئین کے سامنے رکھنے کے بجائے اس مسئلے کی وجہ تلاش کرنے کا کام انجام دیا اور اس مسئلے کی وجہ تلاش کر کے اس کا حل نکالنے کی کوشش کی اور قارئین کو یہ بتانے کی کوشش کی کہ اس مطالعے و مشاہدے سے ہم اس مسئلے کو آسانی سے حل کر سکتے ہیں تاکہ اس کے ہر پہلو کو آسانی سے سمجھا جا سکے۔

شعور کی رو: افسانوں میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئیں اور شعور کی رو کی تکنیک کا استعمال ہونے لگا۔ جدید دور کے افسانوں میں یہ عنصر پایا جاتا ہے۔ جدید افسانہ نگار اپنے افسانوں میں داخلی خود کلامی کی رو کی تکنیک کا سہارا لیتا ہے۔ اس میں افسانہ نگار کردار کے داخلی اور ذہنی عمل پر توجہ دیتا ہے۔

پلاٹ: انسانی زندگی سے متعلق واقعات کو فنی ترتیب سے پیش کرنے کو پلاٹ کہتے ہیں جو کہانی کا کوئی ایک پہلو قاری کے ذہن پر اپنا اثر چھوڑتا ہے۔ پلاٹ کی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔ سادہ پلاٹ، پیچیدہ پلاٹ، غیر منظم پلاٹ، ضمنی پلاٹ۔ پلاٹ میں آغاز، وسط، انجام ترتیب وار پیش کیا جاتا ہے۔ اس میں خاص ربط پایا جاتا ہے جس سے کہانی میں بکھراؤ نہ ہو۔

اس کے علاوہ ماورائے حقیقت، تصوریت، جمال پرستی، وجودیت، علامت نگاری، تجریدیت جیسی خصوصیت جدید افسانوں میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ جدید ادب میں فرد کو اپنی شناخت و حسیت کی فکر کا شدت سے احساس ہے جو کہ جدید ادب کا خاص موضوع ہے۔

خواتین افسانہ نگار

قرۃ العین حیدر: اردو ادب کی مشہور و مقبول افسانہ نگار قرۃ العین حیدر 20/جنوری 1926 کو علی گڑھ میں پیدا ہوئیں۔ قرۃ العین حیدر کی افسانہ نگاری جدید طرزِ تحریر کا آغاز ہے۔ ان کے افسانے جدید خوبیوں سے معمور ہیں۔ ان کی افسانہ نگاری کا آغاز اس وقت ہوا جب بیسویں صدی کی دنیا کئی ذہنی اور سیاسی انقلابات سے گزر رہی تھی۔ دو عظیم جنگیں، تقسیم، ملکی اور بین الاقوامی سیاست سے انسانی زندگی بیزار تھی۔ انھیں موضوعات کو قرۃ العین حیدر نے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا اور اپنے فن کو بلندیوں تک پہنچا دیا۔

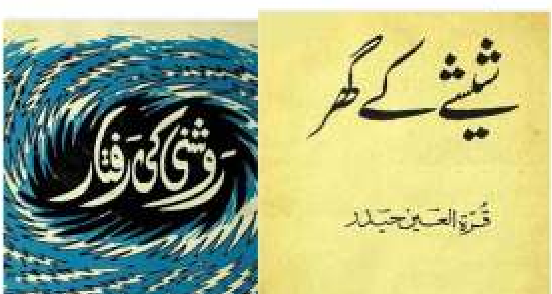

ان کے افسانوی مجموعے شیشے کا گھر، جلاوطن، روشنی کی رفتار، کار امن، ہاؤسنگ سوسائٹی وغیرہ ہیں۔ وہ منفرد طرزِ اسلوب کے ذریعہ ماضی و حال دونوں کو اپنے افسانوں کا موضوع بناتی ہیں۔ وہ اردو کی حساس اور ذہین افسانہ نگار ہیں اور یہی فن ان کو تمام افسانہ نگاروں سے منفرد کر دیتا ہے۔

واجدہ تبسم: اردو ادب کی مشہور افسانہ نگار واجدہ تبسم 16/مارچ 1935 کو امراوتی، مہاراشٹر میں پیدا ہوئیں۔ انھوں نے مسلم اعلیٰ اور متوسط طبقے کی شکست و ریخت اور نئی اور پرانی نسلوں کے ٹکراؤ کو اپنے

افسانوں کا موضوع بنایا۔ وہ حیدرآباد کے مسلم سماج کے مخصوص طبقے مثلاً نوابوں کے استحصالی نظام کو بے نقاب کرتی ہیں۔ ان کے افسانوں میں طوائف مرکزی موضوع ہوتی ہے۔ حیدرآباد کے نوابوں کی عیاشیاں اور طوائفوں سے رشتے اور محلوں میں عورتوں پر ہونے والے ظلم وستم کی داستان جیسے موضوعات کو اپنے افسانوں میں پیش کرتی ہیں۔ تہذیب کی آڑ میں اس طبقے کی عیاشیوں کو پیش کرنا ان کا اصل مقصد ہے۔ اترن، نولکھا ہار، تین جنازے، آگ میں پھول، جھوٹن، ناگن، ٹھکانا وغیرہ جنسی میلانات کے مشہور افسانے ہیں۔ سماج کے اس موضوعات کو انھوں نے بے باکی سے قلم بند کیا ہے۔

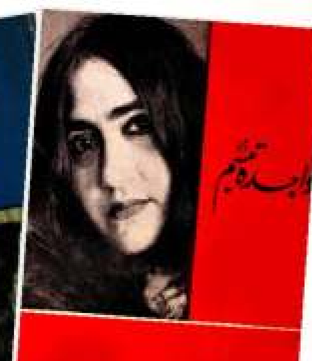

ان کے افسانوں کا پلاٹ سیدھا سادہ ہے اور اس میں الفاظ کی روانی موجود ہے۔ ماضی اور حال دونوں کا امتزاج ان کے افسانوں میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ کبھی کبھی فلیش بیک تکنیک کا بھی استعمال کرتی ہیں۔ ان کے کردار ایسے معاشرے کے ہیں جہاں گھٹن، نفسیاتی بے چینی اور الجھن ہے۔ موضوع کے اعتبار سے زبان کا استعمال کرتی ہیں۔ رواں دواں لب و لہجہ ان کے اسلوب کی خاص پہچان ہے۔

جیلانی بانو: آزادی کے بعد سے افسانہ نگاروں میں جیلانی بانو کا ایک اہم نام ہے۔ جیلانی بانو 14 رجولائی 1936 کو بدایوں، اتر پردیش میں پیدا ہوئیں مگر والد کی ملازمت کے سلسلے میں ان کے اہل وعیال نے حیدرآباد میں مستقل طور پر سکونت اختیار کرلی۔ ترقی پسند تحریک کے عروج و زوال کے زمانے میں اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا جس کی وجہ سے ان کی تحریروں میں حیدرآباد کی تہذیب نمایاں ہوتی ہے۔ ان کے افسانوں میں مسلمانوں کے سیاسی، سماجی اور ثقافتی مسائل اور تقسیم ملک کے اثرات

دکھائی دیتے ہیں۔ انھوں نے دکن سیاست کے عروج وزوال اور تیلنگانہ تحریک کو قریب سے دیکھا ہے اور تیلنگانہ تحریک سے متاثر رہی ہیں۔ روایت اور بغاوت ان کے افسانوں میں موجود ہے۔ سماجی اور زندگی کی تلخ حقیقتوں سے پردہ اٹھاتی ہیں۔ ہندوستانی عورتوں کے ظلم وستم کے خلاف اپنے افسانوں کے ذریعے آواز اٹھاتی ہیں اور اپنے زمانے کے فرسودہ رسم و رواج کو بے نقاب کرتی ہیں۔

اکثر فلیش بیک تکنیک کا استعمال کرتی ہیں۔ ان کے کردار حقیقی دنیا کے ہوتے ہیں۔ سماج کے نچلے اور متوسط کردار سے متاثر ہوتی ہیں اور ان کے دکھوں کو بڑی فنکاری سے پیش کرتی ہیں۔

ان کے افسانے ''موم کی مریم''، ''سونا آنگن''، ''دوشالہ'' وغیرہ ہیں۔ جیلانی بانو کو زبان پر قدرت حاصل ہے۔ مکالمے چست اور پلاٹ گٹھیلا ہوتا ہے۔ جیلانی بانو کے افسانے فن تخلیق کے اعلیٰ نمونے ہیں۔

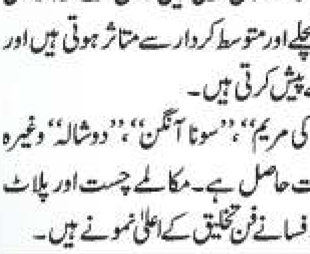

ذکیہ مشہدی: دور حاضر کی مشہور افسانہ نگار ذکیہ مشہدی 1945 کو لکھنؤ میں پیدا ہوئیں۔ اپنے افسانوں میں وہ نفسیاتی موضوعات کی ترجمانی کرتی ہیں ساتھ ہی ساتھ سابق قدروں اور ثقافتی معیاروں پر بھی ان کی نظر رہتی ہے۔ فرقہ وارانہ فسادات کے نتیجے میں سماج کے نچلے طبقے کے افراد کی بے بسی، بدحالی کو الفاظ کا جامہ پہناتی ہیں۔ وہ مختلف موضوعات پر افسانے لکھتی ہیں۔ ان کے افسانوں کا ایک اہم

موضوع اردو زبان کا مسئلہ ہے اس بارے میں بھی وہ فکر مند رہتی ہیں۔ ذکیہ مشہدی کے تین افسانوی مجموعے ہیں:

(1) پرائے چہرے 1984

(2) تاریک راہوں کے مسافر 1993

(3) صدائے بازگشت 2003

حالات حاضرہ پر ان کی گہری نظر ہے۔ وہ طبقاتی کشمکش کو شدت سے محسوس کرتی ہیں۔ ہندو مسلم کے بیچ پھیلی کشیدگی کو وہ فسادات کے تناظر میں دیکھتی ہیں۔ فسادات میں سماج کے معصوم اور بے گناہ لوگوں کی ناانصافی کو افسانوں میں پیش کیا گیا ہے۔

ذکیہ مشہدی کے افسانے زندگی کی تلخ حقیقتوں سے پُر ہوتے ہیں اور ان کی تہوں کو کھول کر وہ قاری کے سامنے پیش کرتی ہیں۔

زاہدہ حنا: زاہدہ حنا 15 اکتوبر 1946 کو پیدا ہوئیں۔ وہ ایک معروف افسانہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ صحافی بھی ہیں۔ تقسیم ہند کا کرب اور بے چینی کا احساس صاف طور پر ان کے افسانوں میں دیکھا جاسکتا ہے۔ معاشرے کے مختلف طبقوں سے اپنے کرداروں کا انتخاب کرتی ہیں۔ ان کے افسانوں کے یہ کردار دانشمند ہوتے ہیں اور اپنے تہذیبی ورثے کو سنبھال کر رکھنے کا ہنر جانتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان جا کر بھی اپنی تہذیب و تمدن کو قائم و دائم رکھا ہے۔ زاہدہ حنا منفرد لب ولہجہ کی مالک ہیں۔ ان کے افسانوں میں تصوف و فلسفہ کا عنصر بھی موجود ہے۔

جدید افسانہ نگاروں نے علامت واستعارے کا استعمال کیا اور اس کی روشنی میں ہر روز نئے تجربات کیے اور جدید افسانہ کو ترقی یافتہ شکل بخشی۔ زاہدہ حنا کا افسانوی سفر بھی اسی دور کا ہے۔ انھوں نے بھی علامتوں کے ذریعہ اپنے افسانوں کو نئی جہتیں عطا کیں۔

زاہدہ حنا کا اسلوب ہی ان کی عظمت کا راز ہے۔ ان کی زبان نکھری اور صاف ہے۔ ان کے افسانوں کی کامیابی کا راز ان کے نادر تشبیہات و استعارات، تمثیل اور علامات ہیں۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں عصری مسائل کو بڑی خوبصورتی سے برتا ہے۔

ان کے مشہور افسانے نا کجا آباد، زیتون کی ایک شاخ، بود و نبود کا آشوب، پانیوں میں سراب، زرد ہوائیں زرد آوازیں، میں، امیت، تتلیاں ڈھونڈھنے والی، معدوم ابن معدوم ابن معدوم، رقص مقابر وغیرہ ہیں۔

آمنہ ابوالحسن: آمنہ ابوالحسن ایک حقیقت پسند افسانہ نگار ہیں۔ وہ اپنے افسانوں میں انسانی جذبات کی عکاسی بڑے پُر اثر انداز میں کرتی ہیں۔ ان کی تخلیقی فکر کا مرکزی نقطہ خوف، دہشت و بربریت اور عدم تحفظ ہے۔

آمنہ ابوالحسن نے آزادی اور تقسیم ہند کے بعد اپنے تخلیقی سفر کا آغاز کیا۔ وہ زندگی کے تاریک گوشوں کو اجاگر کرنے کے بجائے زندگی کے روشن پہلوؤں کو اجاگر کرتی ہیں۔ ''کہانی'' ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے جو کہ 1965 میں منظر عام پر آیا۔ وہ افسانہ نگار ہونے کے ساتھ ناول نگار بھی ہیں۔ نفسیاتی نقطۂ نظر سے وہ سماج کی اصلاح کرتی ہیں اور اپنے اردگرد کی سچی اور کڑوی حقیقتوں کو بڑی بے باکی سے اپنے افسانوں میں بیان کرتی ہیں۔ جدید افسانوں کی خوبی یہ تھی کہ اس کے موضوعات اور ہیئت بدل گئے تھے۔ آمنہ ابوالحسن نے بھی اسی طرز میں الگ الگ موضوعات پر افسانے لکھے۔ ان کے افسانے موضوعات کے لحاظ سے بہت وسیع ہیں۔ کردار، پلاٹ، زبان و بیان ہر لحاظ سے ان کے افسانے کامیاب ہیں۔

''ستون'' اور ''دریچہ'' ان کے نمائندہ افسانے ہیں۔ ''کہانی''، ''بائی فوکل'' اور ''چاپ'' ان کے افسانوی مجموعے ہیں۔

اس کے علاوہ نعیم ضیاءالدین، آشا پربھات، خالدہ حسین، غزال ضیغم، بانو قدسیہ، خدیجہ مستور، صدیقہ بیگم، ممتاز شیریں، مسرور جہاں وغیرہ اہم افسانہ نگار ہیں جنھوں نے افسانہ نگاری میں ہمہ جہت کارنامے انجام دیے۔

□□□

Kaniz Fatma
Research Scholar
Dept. of Urdu
Aligarh Muslim University
Aligarh-202001 (U.P)

ڈاکٹر جہاں آرا سلیم

وہ تیرہ 13 دن

میں مسلسل کئی دنوں سے اس کوشش میں ہوں کہ شمشادی بیگم کے متعلق ان تمام لمحوں کو کاغذ پر لفظ بہ لفظ قید کرلوں جو اب فقط یادوں کا حصہ بن کر رہ گئے ہیں لیکن سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ آغاز کہاں سے کروں۔ یادوں کا ایک جنگل ہے۔ پلکوں پہ دنوں، ماہ اور سالوں کے مناظر۔

اکثر زندگی آپ کو ایک ایسے دوراہے پر لاکر کھڑا کردیتی ہے کہ فیصلہ کرپانا مشکل ہوجاتا ہے۔ بیٹے کی سالگرہ کا دن 25 جنوری 2003 ظہر کا وقت تھا۔ نماز پڑھنے جارہی تھی۔ ابھی بہت سے کام کرنے تھے۔ میٹھی ڈش تیار کرنی تھی۔ پلاؤ کا گوشت بگھارنا تھا۔ چاٹ کے لیے چٹنی تیار کرنی تھی۔ میرے شوہر چھت پر تھے میں بھی دھوپ میں نماز پڑھنے کی نیت باندھنے جارہی تھی کہ وہ وہاں آگئے اور کہا ”افضال کا فون آیا ہے، امی کی طبیعت خراب ہے، انھیں میڈیکل کالج لایا جارہا ہے۔“ یہ سن کر ہی میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ چار رکعت فرض پڑھ کر میڈیکل کالج کا رخ کیا۔ ایمرجنسی پہنچی تو معلوم ہوا گاندھی وارڈ لے جایا گیا ہے۔ وہاں پہنچے تو معلوم ہوا تیسری منزل وارڈ نمبر 5 بیڈ نمبر 11 پر ہیں۔ وہاں پہنچی تو دیکھا، ڈاکٹروں کی ٹیم کے درمیان امی بیڈ پر لیٹی ہیں اور میرا چھوٹا بھائی افضال امی کے متعلق ڈاکٹروں سے بات کررہا ہے۔ امی ہوش میں نہیں تھیں وہ بتا رہا تھا کہ رات کا کھانا اور دوا کھا کر دیر تک باتیں کیں، پھر سوگئیں۔ فجر میں اٹھ جایا کرتی تھیں۔ لیکن صبح دیر تک نہیں جاگیں۔ جگانے کی کوشش کی گئی لیکن نہ بولیں اور نہ آنکھیں کھولیں۔ ڈاکٹر کو بلا کر دکھایا، اس نے بتایا، کوما میں چلی گئی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب! امی کو بلڈ شوگر ہے۔ یہ ہیں اب تک کے علاج کی رپورٹ۔

ڈاکٹروں کے جانے کے بعد نرسیں آگئیں۔ یورین ٹیوب ڈال کر پائنتی ایک تھیلی اور شناختی کارڈ لٹکا دیا گیا۔ میں امی کے قریب آگئی اور ان کا سر سہلانے لگی۔ امی کو اکثر سر میں درد ہوتا تھا۔ وارڈ نمبر 5 میں کل تیرہ عدد بیڈ تھے۔ کراہنا، رونا، چیخنا، مریضوں کی دل شگاف آوازوں سے وارڈ گونج رہا تھا۔ ان آوازوں سے اچھے بھلے انسان کو بھی وحشت ہوسکتی تھی۔ لیکن اس وحشت سے بھاگا تو نہیں جاسکتا تھا۔ دن بھر ڈاکٹروں کا آنا جانا لگا رہا۔ شام ہوتے ہوتے امی کو تیز بخار بھی ہوگیا۔

شامیں تو زندگی میں آتی ہی تھیں لیکن آج کی شام شاید پہلی تھی جو اس قدر اداس تھی۔ انسان جب کسی کرب یا آزمائش سے گزرتا ہے تو ایک ایک ساعت ایک ایک برس بن جاتی ہے۔ رات ایک بجے کا وقت تھا، بیڈ نمبر 13 کا مریض جو ایک کمسن بچی تھی، عمر کوئی بارہ تیرہ سال، درد اور تکلیف سے پچھاڑیں کھا رہی تھی، ڈاکٹر اور تیماردار اس کے پاس موجود تھے۔ میری امی جو دل کی بہت ہی کمزور تھیں، کسی کی کراہ سن کر پریشان ہوجاتی تھیں، ان پر بچی کی دلدوز چیخوں کا کوئی بھی اثر نہیں تھا۔ بچی کے دونوں پیر پنڈلیوں تک اودے رنگ کے ہوگئے تھے، تشخیص سے معلوم ہوا

کہ زہر پھیل رہا ہے۔ پنڈلیوں تک پیر کاٹنا پڑیں گے ورنہ زہر اوپر تک جسم میں پھیل جائے گا۔ یہ سب کیسے ہوا، پوچھے جانے پر معلوم ہوا کہ کھیت پر کام کر رہی تھی، کسی زہریلے کیڑے نے کاٹ لیا، لیکن وہ سانپ نہیں تھا۔

بیڈ نمبر 12 پر ایک ادھیڑ عمر خاتون تھیں۔ ان کی سانسیں دھونکنی کی مانند چل رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا جسم میں سمائیں گی ہی نہیں۔ ان کے ساتھ دو بیٹے تھے۔ ایک بیٹا نوکری کرتا تھا کسی آفس میں۔ دوسرا کپڑے کا بزنس کرتا تھا۔ جو بیٹا کاروباری تھا وہ دن کے وقت میں ماں کی دیکھ بھال کرتا تھا، دوسرا جو آفس جاتا تھا، رات کے وقت ماں کے پاس رہتا تھا، ہاتھ منہ دھلانا، کپڑے تبدیل کروانا، سر میں تیل لگا کر کنگھا کرنا، کھانا کھلانا، دوا کھلانا، سب کام دونوں بیٹے انجام دے رہے تھے۔

چھبیس جنوری کی صبح ہوئی تو آزادی کے نغموں سے فضا گونج اٹھی۔ ہر طرف سے وطن پر جاں نثار کرنے والے نغموں کی صدائیں آرہی تھیں۔ ان نغموں کا سنگیت اور بول دونوں ہی دل کو چھو لینے والے تھے۔ اچانک ایک کونے سے رونے اور چیخنے کی صدائیں بلند ہوئیں۔ معلوم ہوا کہ بیڈ نمبر 4 کا مریض آزادی کی صبح بڑی خاموشی کے ساتھ اپنے مالک حقیقی سے جاملا۔ اسے کڈنی میں انفکشن تھا۔ اس کی بیوی جوس نکال کر جب اسے پلانے چلی تو وہ ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ بیوی دھاڑیں مار کر رو رہی تھی۔ کہہ رہی تھی کہ ابھی تو بات کر رہے تھے۔ بھگوان ای کا کردیو۔ وارڈ کے لوگوں نے پاس جا کر اس کو اور متعلقین کو ڈھارس بندھایا ''جیسی بھگوان کی مرضی، اوپر والے کی مرضی کے آگے کوئی کچھ نہیں کرسکتا، ان کی آتما کی شانتی کی دعا کرو''۔

راؤنڈ پر آئے ڈاکٹر نے امی کو آج وارڈ 4 میں شفٹ کردیا، اس وارڈ میں کل 26 بیڈ تھے، تیرہ ایک قطار میں اور تیرہ دوسری قطار میں، درمیان میں دو فٹ کا راستہ تھا۔ امی کو یہاں بیڈ نمبر 13 ملا، یہ کھڑکی کے بالکل قریب تھا۔ یہاں سے زمین و آسمان دونوں دکھائی دیتے تھے۔ سڑک پر دوڑتی گاڑیاں اور آتے جاتے لوگ، کھڑکی کے ٹھیک نیچے ایک کینٹین تھی۔ یہ کھڑکی فقط ایک کھڑکی نہیں تھی بلکہ اندر کی وحشت سے ذرا دیر کو نجات حاصل کرنے کا ایک ذریعہ بھی تھی۔ اس جگہ کھڑے ہو کر اکثر میں جانے کن کن خیالات میں ڈوب جاتی۔ یہ دنیا اور اس دنیا کے ہنگامے کس قدر عجیب ہیں۔ اگر یہ ہنگامے نہیں ہوتے تو دنیا کیسی ہوتی؟ مجھے حضرت آدم کا وہ وقت بھی یاد آیا جب انھیں اپنی غلطی کے لیے آسمان سے زمین پر اتارا گیا اور وہ بھی جب آدم کی دلجوئی کے لیے ماں حوا وجود میں لائی گئیں اور اس کے بعد آدم کی اولادوں کا وجود۔

27 جنوری راؤنڈ پر آئے ڈاکٹر نے برین کا سٹی اسکین لکھا، افضال اور اس کے دوست اسٹریچر سے امی کو تیسری منزل سے نیچے لائے اور سٹی اسکین کروایا۔ شام تک رپورٹ بھی آگئی۔ دماغ میں کئی جگہ کلوٹنگ نکلی۔ ڈاکٹر صاحب، امی ٹھیک ہو جائیں گی؟ میں نے پوچھا۔ کیوں نہیں! ہوش میں کب تک آئیں گی؟ کل پرسوں بھی ہوش میں آسکتی ہیں۔ یا زیادہ دن بھی لگ سکتے ہیں دعا کیجیے۔

28 جنوری کو ڈاکٹر نے خون کی ایک نئی جانچ لکھ دی۔ جس کی رپورٹ ممبئی سے آنی تھی۔ عزیزوں میں جس کو امی کی بیماری کا پتہ چل رہا تھا، وہ ان کی عیادت کے لیے آرہا تھا۔ وہ بچی جس کے پیر کاٹے جانے کی بات ہو رہی تھی، اسے بھی آج صبح وارڈ نمبر 5 سے وارڈ نمبر 4 میں شفٹ کردیا گیا۔ اس کی درد سے تڑپتی چیخیں اب بھی دل ہلا دینے والی تھیں۔ رات کے نو بجے تھے، اسے جھٹکے پڑتے تو چار چار لوگ بھی سنبھال نہیں پاتے۔ اس وقت بھی اسے جھٹکے لگ رہے تھے۔ پوری طاقت کے ساتھ اچھلی پھر خون کی دو الٹیاں ہوئیں، ان الٹیوں کے ساتھ ہی اس کی چیخیں بند ہوگئیں، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ایک وقت ایسا بھی زندگی میں آئے گا، جب اتنے قریب سے موت کا منظر دیکھوں گی۔ مرتے ہوئے لوگوں کو دیکھنے سے مجھے خوف آتا تھا۔

29 جنوری کو جب امی کے جسم کا اسپنج کر رہی تھی، پیٹھ میں کئی زخم دکھائی دیے۔ یہ کیسے پڑ گئے؟ کیوں کہ ہر آدھے گھنٹے میں انھیں کروٹ دلائی جاتی تھی۔ پاؤڈر لگایا جاتا تھا، ڈاکٹر نے ایک مرہم لگانے کے لیے تجویز کیا۔ 30 جنوری آج بھی امی نے آنکھیں کھول کر نہیں دیکھا۔ ہم نے پھر راؤنڈ پر آئے ڈاکٹر سے جاننا چاہا کہ ہوش کب آئے گا؟ ''دس دن کے اندر آجانا چاہیے۔ ہماری کوشش جاری ہے۔ دماغ میں کئی کلاٹنگس ہیں۔'' ڈاکٹر تسلی دیتا تو امید بندھتی۔ اسپتال کا یہ گاندھی وارڈ اب گھر جیسا لگنے لگا تھا اور مریضوں کے تیماردار ایک پریوار جیسے۔ کوئی چھوت چھات نہیں، ایک دوسرے سے سب اس طرح پیش آتے اور بولتے گویا ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتے ہوں۔ قومی یکجہتی کا سب سے خوبصورت نظارہ یہاں دکھائی دیتا تھا۔ زندگی سے بڑھ کر کچھ نہیں، سب زندگی کے لیے لڑ رہے تھے، ڈاکٹر نے کہا تھا دس دن میں ہوش آجائے گا۔ اسی امید پر تمام دن کٹ جاتا۔ دوا کے ساتھ دعائیں بھی جاری تھیں۔ 31 جنوری کو امی کے ہاتھ پیروں پر مہین مہین چھالے نظر آئے۔ ڈاکٹر نے دوا بدلی ایک نیا مرہم لگانے کے لیے لکھا۔ مرہم لگانے کے کچھ گھنٹوں بعد چھالے پھوٹ گئے اور اس میں سے پانی رسنے لگا۔ قمیص بھیگ گئی۔ کپڑے تبدیل کراتا

ضروری ہو گیا۔ بڑی مشکل سے سوئیٹر اتارا گیا اور پھر قمیص۔ جس مشکل سے کپڑے اتارے گئے اسی مشکل سے پہنائے جاسکے۔ یکم فروری کو ابھی تک امی کو صرف دودھ اور جوس ہی ناک میں پڑی نلی کے ذریعہ پہنچایا جارہا تھا، لیکن آج مونگ کی دال کا پانی بھی دیا گیا۔ غذا ہضم ہو رہی تھی، یعنی معدہ پوری طرح کام کر رہا تھا۔ غذا دینے سے پہلے انسولین کا انجکشن لگانا پڑتا تھا، جو پیٹ کی کھال میں لگایا جاتا تھا۔ یہ کام میری چھوٹی بہن کرتی تھی۔ ابو اسپتال آنے کے لیے پریشان تھے۔ انھیں تسلی دے کر روکا گیا تھا۔ سب جانتے تھے کہ وہ امی کو اس حالت میں دیکھ نہیں پائیں گے۔ وہ خود بھی ہارٹ کے مریض تھے۔ چھوٹی بیٹی کی شادی کے بعد گھر میں تین لوگ تھے۔ افضال، ابو، امی۔ جب سے امی کی طبیعت خراب ہوئی، ابو نے گھر سے باہر نکلنا بند کر دیا تھا۔ فقط نماز کے لیے مسجد تک جاتے تھے، جو گھر کے ٹھیک سامنے تھی۔ حالانکہ پہلے بارہ بنکی سے لکھنؤ روزانہ اپ ڈاون کرتے تھے۔ لکھنؤ میں ایک شوروم کے وہ منیجنگ ڈائرکٹر تھے۔ 2 فروری کو گاندھی وارڈ میں امی کو داخل ہوئے دسواں دن تھا۔ ڈاکٹر مظہر حسین راؤنڈ پر تھے اور ان کے ساتھ جونیئر ڈاکٹروں کا قافلہ۔ انھوں نے امی کی رپورٹس دیکھی، اپنی فیزیشین زبان میں ڈاکٹروں کے ساتھ تبادلہ خیال کیا اور آگے بڑھ گئے۔ راؤنڈ پورا ہونے کے بعد میرے بھائی افضال کو بلایا۔ ڈاکٹروں سے مل کر جب افضال واپس آیا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ کیا کہا ڈاکٹر نے؟" آپ چاہیں تو گھر لے جاسکتے ہیں۔ جتنی سیوا کر سکتے ہیں کر لیجیے۔" یہ سن کر کسی سے آگے کچھ نہ پوچھا گیا۔ امید پر دنیا قائم ہے اور امید ہی دم توڑ دے تو دل کی تسلی کے لیے کچھ نہیں بچتا۔ سوال یہ تھا کہ ابو کو ڈاکٹر کی بات کیسے بتائی جائے۔ وہ تو پل پل اس انتظار میں تھے کہ امی صحت مند ہو کر گھر آجائیں گی۔ سوال یہ بھی تھا کہ گھر پر امی کی دیکھ بھال کرنے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ سب بیٹیوں کی شادیاں ہو گئیں۔ سوال یہ بھی تھا کہ ابو بہت کمزور ہو گئے ہیں۔ جب تک ہوش میں تھیں سب کام اپنے ہاتھ سے کرتی تھیں۔ افضال کا دماغ تمام سوالوں کے گرد گھوم رہا تھا، لیکن وہ کچھ کہہ نہیں پا رہا تھا۔ 4 فروری یوں ہی گزر گئی۔ وارڈ نمبر 4 میں تمام مریض سیریس کنڈیشن کے تھے۔ ہر روز پرانے مریضوں کی جگہ نئے مریض آجاتے تھے۔ 5 فروری کو افضال کی پریشانی دیکھ کر میں نے کہا کہ تم پریشان کیوں ہو؟ وہ اکیلی تمھاری ہی نہیں ہم سب کی بھی ماں ہیں۔ اس وقت انھیں ہماری ضرورت ہے۔ ایک دو دن اور دیکھ لیتے ہیں۔ پھر گھر لے چلیں گے۔ اس سے پہلے ابو کو اس سانحہ کو برداشت کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار کرنا ہوگا اور یہ کام تمھیں کرنا ہے۔ میری بات سن کر افضال کے چہرے پر فکر کی لکیریں کچھ کم ہوئیں۔ وہ دیر تک ہمارے ساتھ بیٹھ کر امی کی باتیں کرتا رہا۔ پھر اس نے کہا کہ ابو کو ذہنی طور پر تیار کرنے کے لیے اپنے ایک دوست کو آج ہی بھیجے گا۔ 6 فروری کو میری تیسری بہن اور اس کی بیٹی دن میں رکنے کے لیے آگئیں۔ میں اور میری بہن شاہین کچھ دیر کے لیے گھر چلے آئے۔ شام تک ہم پھر واپس اسپتال پہنچ گئے۔ افضال پریشان دکھا۔ شاید نیند پوری نہ ہونا وجہ ہو۔ ہم نے زبردستی اسے کچھ دیر آرام کرنے کے لیے کہا۔ رات کے نو بجے سے مجھے بھی عجیب سی الجھن محسوس ہوئی۔ میری بہنوں یاسمین اور شاہین نے زبردستی میرے بیٹے کے ساتھ جو اس وقت اسپتال میں موجود تھا، مجھے بھی گھر بھیج دیا، میرا سر چکرا رہا تھا۔ میں دوا لے کر لیٹی اور آنکھ لگ گئی۔ موبائل پر ٹرنگ ٹرنگ کی آواز پر میری آنکھ کھل گئی۔ میرے شوہر نے فون ریسیو کیا۔ رات کے دو بجے تھے۔ وہ مجھے لے کر اسپتال آگئے۔ وارڈ میں پہنچ کر دیکھا، بہت سے لوگ امی کے بیڈ کے پاس جمع ہیں۔ دونوں بہنیں سسک سسک کر رو رہی ہیں۔ افضال بھی رو رہا ہے۔ اس کو اس کے دوستوں نے سنبھال رکھا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی، میرے گلے لگ گیا۔ آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ فجر تک کچھ ایسا ہی ماحول بنا رہا۔ میرے شوہر نے افضال کے ساتھ مل کر اسپتال کی کارروائی پوری کروائی۔ بچی ہوئی دوائیں سرنج وغیرہ جو استعمال میں نہیں آئی تھیں، اسپتال میں ہی ڈونیٹ کر دیں۔ گھر والوں کو اطلاع دے دی گئی۔ وارڈ نمبر 4 اور 5 کے بہت سے لوگ رخصت کے وقت نیچے تک آئے۔ سب کی آنکھیں نم تھیں۔ ایک ساتھ کئی ہاتھ الوداع کے لیے لہرائے۔ آدھے گھنٹے کے اندر ہم گھر پہنچ گئے۔ جمعہ کا دن تھا، سٹی کا بازار گھر والی سڑک پر لگتا تھا لیکن اس روز بازار نہیں لگا۔ گھر کے باہر اور اندر تعزیت میں آئے لوگوں کا ہجوم تھا۔ امی کے چاہنے والوں کی ہچکیاں بندھ گئیں تھیں۔ میں افضال، یاسمین، شاہین ابو سے چمٹ گئے۔ اس موقع پر بچوں کے ساتھ ابو نے صبر ایوب کا مظاہر کیا۔ تمام انتظامات مکمل تھے۔ تدفین کا وقت جمعہ کی نماز کا رکھا گیا تھا۔ ہم ساتوں بہنوں نے مل کر امی کو غسل دیا اور کفنایا۔

آج بھی جب امی کی یاد آتی ہے تو گاندھی وارڈ کے وہ تیرہ دن بھی یاد آجاتے ہیں۔

□□□

Dr. Jahan Ara Saleem
292/152E-2, Victoria Ganj
Near Post Office
Lucknow-226003 (U.P)

ناولٹ

تحسین کاظمی

جب صبح ہوئی

ہر طرف گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ شام کی ڈھلتی دھوپ دیوار کی بلندی تک جا پہنچی تھی اور نیچے دھندلکے پھیل رہے تھے۔ صحن میں اگی لمبی لمبی گھاس آپس میں سرگوشیاں کر رہی تھیں۔ سیڑھیوں کے پاس امرود کے درخت پر لٹکا طوطے کا خالی پنجرا ہوا کے دباؤ سے آہستہ آہستہ جھول رہا تھا۔ ایک ہول ناک سناٹا ایک جان لیوا سکوت جیسے اس تباہی اور بربادی کی داستان سنانے کو بیتاب تھا۔ وہ آہستہ آہستہ قدم بڑھاتی حسرت سے ہر چیز کو دیکھتی لمبی لمبی گھاسوں میں الجھتی، کانٹوں کو روندتی خالی الذہن مشرقی دالان کی طرف بڑھنے لگی۔ سامنے قدِ آدم آئینہ دیکھ کر وہ ٹھٹک گئی۔ گرد و غبار کی پرتوں نے اس کی چمک پر پردہ ڈال دیا تھا۔ اس نے ہولے سے ہاتھ بڑھا کر اس پر پھیرا اور سامنے اپنا ہی سراپا دیکھ کر چونک گئی۔ وقت کی بے درد دوڑ اسے ضعیفی کی طرف کھینچ رہی تھی یا حالات کی بے رحمی نے اس سے اس کی جوانی چھین لی تھی۔

'جمن بابا سحر کی شام کتنی جلدی ہو جاتی ہے۔' وہ جمن بابا کی طرف دیکھے بغیر بولی۔

'پرانی یادیں تازہ مت کیجیے بی بی صاحبہ۔' جمن بابا کی کمزور آنکھیں آنسوؤں میں ڈبڈبا رہی تھیں۔ 'یہ دیمک کی طرح انسان کو چاٹ جاتی ہیں۔'

'سب کچھ ختم ہو گیا جمن بابا، میں کتنی دیر سوئی کہ بیدار ہونے پر اپنا آشیانہ اجڑا ہوا پایا۔' وہ کہتی ہوئی ہال والے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

گرد آلود فرنیچر اپنی جگہ پر سسک رہے تھے۔ چھت پر مکڑیوں کے جالے جھول رہے تھے۔ وہ خالی خالی آنکھوں سے چھت کی طرف دیکھنے لگی۔

'بی بی صاحبہ! حویلی کی صفائی کرانے میں تھوڑا وقت لگے گا تب تک میں آپ کے لیے نیچے والا کمرہ خالی کیے دیتا ہوں جو بڑے صاحب نے مجھے رہائش کے لیے دیا تھا۔' جمن بابا نے جو کچھ کہا وہ اس نے سنا ہی نہیں کیونکہ قہقہوں کی گونج اس کی سماعت سے ٹکرانے لگی تھی۔

'اے ہے لڑکیوں یہ شور غل بند کرو۔ دلہن تھک گئی ہوگی۔ اسے اس کے کمرے میں پہنچا دو۔' دادی جانی نے لڑکیوں کے فلک شگاف قہقہوں کے درمیان اپنی آواز بلند کرنے میں پورا زور لگا دیا۔

'او ہو! تو دلہن کون سی پرائے گھر آئی ہے، اپنے کمرے سے سلطان بھائی کے کمرے میں ہی تو شفٹ ہونا ہے خود چلی جائے گی۔'

'نہیں یہ نازک اندام' چچا کی لاڈلی چچی جان کی نازوں کی پالی

پیدل تھوڑے ہی جائے گی۔ انھیں گودی میں اٹھایا جائے۔' ثنا کے کہتے ہی لڑکیاں اس پر ٹوٹ پڑیں۔

'اے خبردار!' چچی جان دہاڑیں۔ 'میری پھول سی بچی کو تنگ مت کرو۔'

'لو کلیجہ پھٹنے لگا۔' اور لڑکیوں کے مشترکہ قہقہے گونج اٹھے۔

وہ بہت خوش تھی۔ سلطان جو اس سے بچپن سے ہی منسوب تھا اور جوانی کی ڈگر پر قدم رکھتے ہی اس کے تمام ہوش و حواس پر قابض ہو چکا تھا آج اسے مل گیا تھا۔ سلطان اس کے تایا ابو کا بیٹا تھا اور دادا صاحب نے اسے بچپن میں ہی سلطان سے منسوب کر دیا تھا مگر دادا اور تایا کی وفات کے بعد تائی جی نے اس رشتے کو تکمیل تک پہنچایا اور ایمن نہ صرف اپنے بابا اماں کی دل و جان تھی بلکہ حویلی میں بسنے والے ہر فرد کی لاڈلی تھی۔ تائی جی تو اس کی بلائیں لیتی نہ تھکتی تھیں گو کہ حویلی میں وہ اکیلی لڑکی نہ تھی۔ سلطان کی دو بہنیں ثنا، صبا اور مرحومہ پھپھو کی اکلوتی بیٹی اریبہ بھی موجود تھیں مگر سب کی بے پایاں محبت کی حقدار گویا صرف وہی تھی۔ بابا اور اماں تو اسے دیکھ کر جیتے تھے۔ دادی جانی دن بھر میں پچاس مرتبہ اس پر صدقہ قربان کرتیں۔ ایسے ماحول میں جہاں صرف چاہتیں تھیں، مسکراہٹیں تھیں وہ بے فکر مستیوں میں سرشار پوری حویلی میں اچھلتی کودتی تھی۔ یہ حویلی اس کے لیے جنت کا نمونہ تھی۔

زندگی رنگین تھی۔ بے فکری اور اطمینان کا احساس تھا۔ ہر پھول مسرور تھا ہر غنچہ مسکرا رہا تھا۔ موتیا اور بیلے کی بھینی بھینی خوشبوئیں فضا میں چھائی ہوئی تھیں۔ وہ جھولے پر بیٹھی آہستہ آہستہ پینگیں مار رہی تھی۔ اریبہ اس کے ساتھ تھی۔

'ایک بات پوچھوں ایمن؟' وہ اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔

'اوں!.....ہاں پوچھو۔' وہ جیسے سوتے سے جاگی۔

'سلطان بھائی کی بن کر تم خوش تو ہو ناں؟'

'یہ کیسا سوال ہے؟' وہ مسکرائی۔

'اس میں ناخوش ہونے والی کون سی بات ہے۔'

'ویسے رشتہ بچپن میں ہی طے ہونے کی میں قائل نہیں۔ کیونکہ بچہ تو نادان ہوتا ہے مگر سمجھدار ہونے پر اس کا دل کسی اور طرف مائل ہو جائے۔ اس کی محبت کوئی دوسرا ہو تو۔'

'لیکن میں تو سلطان کو پسند کرتی ہوں۔ اس لیے میرے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوئی۔' وہ اطمینان سے رخساروں پر مچلتی لٹوں کو پیچھے سرکاتے ہوئے بولی۔

'ضروری تو نہیں کہ سلطان کے ساتھ بھی انصاف ہوا ہو۔' اس نے اریبہ کو یوں چونک کر دیکھا جیسے اس کا دماغی توازن بگڑ گیا ہو۔

'اگر ایسا ہوتا تو سلطان انکار کر سکتے تھے۔ وہ مرد ہیں۔' وہ سنبھل کر مگر گھٹی گھٹی سی آواز میں بولی۔

'شاید تم بھول رہی ہو کہ اس حویلی کے قاعدے قانون کسی کو اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ وہ بزرگوں کے فیصلوں کو رد کرے۔'

'ان باتوں سے تمھارا کیا مطلب ہے؟' اریبہ کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ دیکھ کر اس کا دل ایک انجانے خدشے سے کانپ اٹھا۔

'جانے دو۔ دو زندگیاں تو برباد ہو ہی چکی ہیں اب تیسری.....' وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر جانے کو پلٹی۔

'تم مجھے الجھن میں ڈال کر یوں نہیں جا سکتیں۔' اس نے لپک کر اریبہ کی کلائی تھام لی۔ 'کون ہیں یہ تین زندگیاں؟'

'سلطان میں اور تم' وہ سفاکی سے کہہ کر چلی گئی اور ایمن کے دل کی دنیا میں بھونچال آ گیا۔ وہ ٹوٹتی بکھرتی دم بخود سی کھڑی اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔

وہ خاموش ہو گئی تھی۔ اداسیاں سائے کی طرح اس سے چپک کر رہ گئی تھیں۔ اس کی یہ کیفیت سب کے لیے تشویش ناک تھی۔ بابا پریشان تھے۔ اماں باہوں میں سمیٹ کر کہتیں 'کیا ہو گیا ہے میری چندا کو۔'

'سلطان نے تو کچھ نہیں کہا۔' تائی جی نے شک کا اظہار کیا۔ اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔

'پھر کیا بات ہے میری گڑیا؟' انھوں نے جھک کر اس کی پیشانی چوم لی۔

'کسی کی نظر تو نہیں لگ گئی میری بچی کو۔' دادی جانی نے کھینچ کر اسے اپنی آغوش میں بھر لیا۔ 'ارے کریمن ذرا مرچ اور رائی لا کر بچی کی نظر اتار دو۔' انھوں نے ملازمہ کو آواز لگائی اور خود اس کے چہرے پر جھک گئیں۔ 'کیسی مرجھا کر رہ گئی ہے میری پھول سی بچی۔'

اتنا پیار، اتنی چاہتیں۔ مگر وہ جو اس کی زندگی کا مالک تھا اس قدر بے رحم اور بے وفا۔ اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ حالانکہ سلطان کی طرف دیکھ کر یہ یقین کرنا مشکل ہو جاتا کہ اریبہ کی باتوں میں صداقت ہے۔ سلطان کی اس کے لیے بے پناہ محبت کیا محض ایک فریب ہے۔ اریبہ جھوٹ بولتی ہے۔ وہ دل کو بہلانے کی کوشش کرتی مگر ناکام رہتی۔ نرگس کا آنسوؤں میں بھیگا چہرہ اس کے تصور کے دائرے میں آ جاتا۔

'یہ مرد اعتبار کے قابل نہیں ہوتے ایمن۔ میں نے اپنے شوہر

سے بے پناہ محبت کی تھی اور انھوں نے بھی چاہتوں کا تمام ذخیرہ میرے دامن میں ڈال دیا تھا، مگر......'

'مگر کیا؟'

'ان کے تعلقات کسی دوسری عورت سے تھے اس کا علم ہوتے ہی میں نے خود ہی انھیں ٹھوکر مار دی۔'

'کیا؟' اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

وہ مکمل طور پر پسینے میں شرابور ہو چکی تھی۔ تو کیا سلطان کی محبت بھی مصنوعی اور ناپائدار ہے۔ اس کی آنکھیں ساون بھادو کی تصویر بن گئیں۔ وہ جس کے نام اس نے تمام دھڑکنیں کر دی تھیں۔ وہ جو اس کی رگ و پے میں سمایا ہوا تھا۔ ہر سانس پر حکومت کر رہا تھا اس کے قریب رہ کر بھی اس سے دور تھا۔ احساس کرب سے اس نے ہونٹ بھینچ لیے۔

'کیا بات ہے ایمن مجھے بتاؤ' سلطان اسے بازوؤں سے پکڑ کر اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا اور وہ جیسے خواب سے بیدار ہوئی۔

'کس نے تمھیں دکھ پہنچایا ہے؟ مجھے بتاؤ میں اس کی تمام خوشیاں چھین کر تمھارے قدموں میں ڈال دوں گا' اس سے پہلے کی سلطان کا والہانہ پن اسے موم کی طرح پگھلا دیتا سلطان کے بدن پر نیلا سویٹر دیکھ کر وہ چونک گئی۔ چند دن قبل یہی سویٹر اریبہ بن رہی تھی اور اس کے پوچھنے پر اس نے بتایا تھا کہ کسی اہم ہستی کے لیے بن رہی ہوں۔ تو یہ وہ اہم ہستی ہے۔

'سویٹر دیکھ رہی ہو۔ اریبہ نے بن کر دیا ہے' وہ اس کی کیفیت سے بے خبر اسے بتا رہا تھا۔

'معلوم ہے۔' وہ گھٹی گھٹی سی آواز میں بولی۔

'اچھا بنتی ہے ناں۔ واقعی اس کے ہاتھ میں جادو ہے۔'

'سب کھانے پر انتظار کر رہے ہیں۔' جمن بابا نے آکر اطلاع دی تو دونوں اٹھ کر چلے گئے۔

عجب موڑ پر زندگی نے لاکر پٹخ دیا تھا۔ اریبہ سے اس کی بات چیت کسی حد تک بند ہو چکی تھی۔ اگر ہوتی بھی تو محض اس کے سوال کے جواب کی شکل میں۔

اس دن تین روز کے بعد سلطان ٹور سے لوٹ کر آئے تھے۔ وہ جو بے قراری سے ان کی راہ دیکھ رہی تھی ملازمہ کے منہ سے ان کی آمد کی خبر ملتے ہی تیز تیز قدم بڑھاتی دھڑکتے دل کے ساتھ باغیچے سے کمرے کی طرف بڑھی مگر دروازے کے قریب پہنچتے ہی اندر سے آرہی مشترکہ قہقہوں کی آواز پر ٹھٹھک گئی۔ یہ آوازیں سلطان اور اریبہ کی تھیں۔ اس سے پہلے اس نے ایسی باتوں پر کبھی توجہ نہیں دی تھی مگر اب حالات دوسرے تھے۔

اب وہ ہر پل ان کی حرکتوں پر نظر رکھنے لگی تھی۔ کمرے میں قدم رکھتے ہی اس کا پورا وجود جھلس اٹھا تھا۔ اریبہ بالکل سلطان کے نزدیک بیٹھی کسی بات پر ہنس ہنس کر لوٹی جارہی تھی اور بار بار اس کا سر سلطان کے شانے سے ٹکرا رہا تھا۔ ایمن کو اچانک روبرو دیکھ کر وہ خاموش ہو گئی جبکہ سلطان کا چہرہ مزید بشاش ہو گیا۔

'اب آپ یہاں سے ٹلنے کا کیا لیں گی۔' وہ اریبہ سے بولا۔

'فی الحال تو یہی کافی ہے۔' اس نے میز پر رکھا ایک بڑا سا پیکٹ اٹھا لیا اور اس کے اندر سے ایک خوبصورت چکن کا سوٹ نکال کر ایمن کو دکھانے لگی۔

'سلطان بھائی میرے لیے لائے ہیں۔ سچ کتنی اچھی پسند ہے ان کی۔ پچھلی دفعہ دہرہ دون سے میرے لیے جو اونی شال لائے تھے اس کا بھی جواب نہیں۔'

'میں نے تو نہیں دیکھی۔' اس نے کنکھیوں سے سلطان کی طرف دیکھا۔

''کیا سلطان بھائی نے آپ کو نہیں بتایا؟'

'اس میں بتانے والی کون سی بات تھی۔ تمھاری چیز تھی میں نے تمھارے حوالے کر دی۔ بات ختم'

'پھر بھی بیوی کے علم میں ہر بات ہونی چاہیے۔' وہ پیکٹ سنبھالتی کمرے سے باہر نکل گئی۔

'گھر میں اور لڑکیاں بھی تو ہیں پھر یہ مہربانی اریبہ پر ہی کیوں؟' وہ زخمی شیرنی کی طرح بھر پڑی اور سلطان اچانک ہوئے اس حملے سے ششدر رہ گئے۔

'میں پوچھتی ہوں آپ نے مجھ سے شادی ہی کیوں کی تھی جب پرانی محبت کو بھلا نہیں سکتے تھے۔' وہ غصہ و غم کی شدت سے کانپ رہی تھی۔

'یہ کیا بکواس ہے؟ تم پاگل تو نہیں ہو گئیں۔' لہجہ نرم لیکن نہایت زخمی تھا۔

'پاگل میں پہلے تھی جو آپ پر اعتبار کر بیٹھی۔ اپنی زندگی کی ہر سانس آپ کے نام کر دی۔' وہ بے اختیار رو پڑی۔

'ایمن......ایمن کیسی حماقت ہے۔' سلطان نے آگے بڑھ کر اس کا چہرہ اپنی ہتھیلیوں میں لے لیا۔ مگر ایمن نے ایک جھٹکے سے ان کے ہاتھ جھٹک دیے۔

'ایک عورت سب کچھ برداشت کر سکتی ہے لیکن یہ قطعی برداشت نہیں کر سکتی کہ......کہ......'

"اس دن اچانک نرگس کی طبیعت خراب ہو جانے کی وجہ سے اسے اسپتال میں ایڈمٹ کرنا پڑا تھا۔ اس وقت صرف یہی دونوں سہیلیاں ایک دوسرے کی غمگسار تھیں۔ لہٰذا اس کی دیکھ بھال کی ذمہ داری وہ بخوبی نبھا رہی تھی۔ اس دن صبح وہ اس کے لیے ناشتہ لے کر ہاسپٹل پہنچی تو سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اچانک کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ چونک کر پلٹی اور سامنے والے کو دیکھ کر قدم لڑکھڑا گئے"

'تم کیا کہنا چاہتی ہو؟' پیشانی کی لکیروں میں مزید اضافہ ہو گیا۔

'جو آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔ پھر بھی پوچھتی ہوں اریبہ کا پھوپھی زاد بہن کے علاوہ اور کیا رشتہ ہے آپ سے؟'

'ایمن۔' وہ بری طرح چیخے۔

'چیخئے مت۔ چیخنے سے آپ کے جرم پر پردہ نہیں پڑ جائے گا۔'

'چلی جاؤ یہاں سے..... چلی جاؤ۔' غصے کی شدت سے وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکے اور اس کی طرف پشت کر کے کھڑے ہو گئے۔

وہ رات کتنی سخت تھی۔ آنسو تھے کہ تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ وہ مکمل طور پر ٹوٹ چکی تھی کیا محبت کا یہی صلہ ہوتا ہے۔ اس نے تو اپنی بے لوث محبت سلطان کی جھولی میں ڈالی تھی۔ پھر یہ بے وفائی کیوں؟ اس نے اشک بار نگاہوں سے سلطان کی طرف دیکھا جو دوسری جانب کروٹ لیے سو رہے تھے۔

اگلی صبح اسے حویلی میں کسی نے نہیں دیکھا۔ وہ جا چکی تھی۔ دور دراز شہر اپنی سہیلی نرگس کے پاس اور تب اس کی تعلیم اور ڈگریاں بہت کام آئیں۔ نرگس کی مدد سے اسے ملازمت مل گئی۔

ایک طویل عرصہ گزر گیا مگر دل کی بے قراری کسی صورت کم نہ ہوئی۔ حویلی کی یادیں اس کا پیچھا نہ چھوڑتیں۔ نرگس سمجھاتی۔

'ایک بے وفا کے لیے کیوں اپنے قیمتی آنسو ضائع کرتی ہو۔'

'دل پر اختیار نہیں۔' وہ بے بسی سے کہتی۔ 'سچ ایک بے وفا کی وجہ سے میں نے اپنا سب کچھ کھو دیا ہے۔ وہ سکون وہ خوشیاں وہ محبتیں جو حویلی میں آٹھوں پہر میرا احاطہ کیے رہتیں تھی۔ بابا اماں مجھے بے انتہا یاد آتے ہیں۔' وہ بے اختیاری سسکنے لگتی۔

ایک فرد کی خطاؤں کی سزا تم نے حویلی کے تمام افراد کو دے ڈالی اور کیا تم یہ خود پر ظلم نہیں کر رہی ہو؟ میری مانو تو واپس گھر لوٹ جاؤ۔'

'نہیں نرگس میں اپنے ارمانوں کو یوں پل پل دم توڑتے نہیں دیکھ سکتی۔'

نہ جانے کتنے لمحے کتنے اوقات اور نہ جانے کتنے ماہ و سال گزر گئے اسے ہوش ہی نہ رہا۔ ہوش رہا تو صرف اپنی زندگی کے ناقابل برداشت بوجھ کا۔ دل کے نہاں خانوں میں درد کی ٹیسیں ابھی بھی اٹھ رہی تھیں۔

اس دن اچانک نرگس کی طبیعت خراب ہو جانے کی وجہ سے اسے اسپتال میں ایڈمٹ کرنا پڑا تھا۔ اس وقت صرف یہی دونوں سہیلیاں ایک دوسرے کی غمگسار تھیں۔ لہٰذا اس کی دیکھ بھال کی ذمہ داری وہ بخوبی نبھا رہی تھی۔ اس دن صبح وہ اس کے لیے ناشتہ لے کر ہاسپٹل پہنچی تو سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اچانک کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ چونک کر پلٹی اور سامنے والے کو دیکھ کر قدم لڑکھڑا گئے۔

'تم؟'

'ہاں میں، اپنی اریبہ کو گلے نہیں لگاؤ گی۔' اریبہ کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔

'یہ کوئی گلے لگ کر رونے کا مقام نہیں۔ لوگ جمع ہو جائیں گے۔' وہ بمشکل آنسوؤں کو ضبط کر کے سختی سے بولی۔

'میں نے تمھیں کل بھی یہاں دیکھا تھا مگر تم کتنی بدل گئی ہو۔' اس نے اس کے ادھ پکے بالوں اور اندر کی طرف دھنسے ہوئے رخسار کو بغور دیکھا۔ پیشانی پر بیشمار لکیریں اور آنکھوں میں جہاں بھر کی ویرانیاں دیکھ کر وہ تڑپ گئی۔

میں تمھیں پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی کہ یہ چہرہ شناسا ہے اور جب میں نے تمھیں پہچان کر آواز دینا چاہی تم تند رفتاری سے گیٹ سے باہر نکل چکی تھیں۔' چند لمحے خاموش رہ کر وہ پھر بولی۔ 'کل میں یہاں اپنے ایک عزیز کو دیکھنے آئی تھی مگر آج صرف تمھارے لیے آئی ہوں۔ مجھے امید تھی کہ تم شاید آج بھی یہاں آؤ گی۔' آنسوؤں کو روک پانا ایمن کے لیے مشکل ہو رہا تھا مگر وہ چہرے پر سختی طاری کیے ناگواری سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔

'دراصل میرے شوہر کی پوسٹنگ اسی شہر میں ہے۔ شاید قسمت کو ہمیں پھر سے ملانا منظور تھا کہ ہم ایک ہی شہر میں موجود تھے۔' ایمن اب بھی خاموش تھی۔

'تمھارے اس طرح حویلی چھوڑ کر آنے کی وجہ میں جانتی ہوں ایمن۔' اس نے ندامت سے نظریں چراتے ہوئے گفتگو کا رخ موڑا۔

'تو تم اس وقت اس کا سوگ منانے آئی ہو یا میرے زخموں پر نمک پاشی کرنے۔'

'میں تم سے معافی مانگنے آئی ہوں۔ حالانکہ میں جانتی ہوں میرا جرم قابل معافی نہیں اور سچائی جاننے کے بعد تم مجھ سے اور بھی نفرت کرنے لگو گی لیکن یہ حقیقت بتا کر شاید میں اپنے دل پر مسلط اس بوجھ کو ہلکا کر سکوں۔'

'کیسی حقیقت؟' لہجہ ابھی سخت تھا۔

'اس سارے معاملے میں اکیلی قصوروار ہوں۔ سلطان بے قصور ہیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ سلطان تم سے منسوب ہیں نہ جانے وہ کس گھڑی میرے ہوش وحواس پر قابض ہو گئے۔ میں چپکے چپکے انھیں چاہنے لگی تھی۔' وہ ایمن کے چہرے کے تاثرات پر دھیان دیے بغیر بولتی رہی۔ 'مگر جب ان کی زندگی میں تمھارے قدم پڑے تو میں حسد کی آگ میں جلنے لگی۔ جو چیز میری نہ ہو سکی تھی اسے کسی اور کا ہوتا دیکھ میں برداشت نہ کر سکی اور تم دونوں کی زندگی میں زہر گھولنے لگی۔ وہ تحائف جو سلطان میرے لیے لاتے تھے میری فرمائش پر لاتے تھے۔ تمھیں اپنے جھوٹے تعلقات کا یقین دلانے کے لیے میں یہ چالیں چل رہی تھی۔ میرا مقصد تمھاری ہنستی کھیلتی زندگی کو جہنم بنانا تھا اور میں اس میں کامیاب ہوئی۔ یقین کرو ایمن سلطان کے دل میں میں نہیں صرف تم بسی تھیں۔ تمھارے لاپتہ ہونے کے بعد وہ بالکل ٹوٹ کر رہ گئے تھے۔ انھوں نے تمھیں بہت تلاش کیا مگر تم نہ ملیں۔ اس دوران میری شادی ہو گئی اور پھر مجھے احساس ہوا کہ تمھارا گھر اجاڑ کر مجھے کیا حاصل ہوا۔ گھر لوٹ جاؤ میری بہن۔ سلطان بھائی اب بھی تمھاری راہ دیکھ رہے ہوں گے۔ میں تین سال سے وہاں نہیں گئی۔ جانے کو جی نہیں کرتا۔ ہر طرف ویرانیاں ہی ویرانیاں نظر آتی ہیں۔ اتنی بڑی حویلی میں محض دو افراد رہ گئے جو چلتی پھرتی لاش نظر آتے ہیں سلطان اور بڑی ممانی۔'

'اور بابا اماں اور دادی جانی؟'

'تمھاری جدائی کے غم نے انھیں نگل لیا۔ ایک ایک کر کے تینوں نے دنیا چھوڑ دی۔'

ناشتہ دان اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر سیڑھیوں پر لڑھکنے لگا اور اسے کچھ ہوش نہ رہا۔ ہوش آیا تو خود کو اسی اسپتال کے وارڈ میں پایا۔

'مجھے گھر جانا ہے مجھے سلطان کے پاس جانا ہے۔' وہ چیخ چیخ کر رونے لگی۔

آج حویلی کے اندر قدم رکھتے ہوئے ایسا لگ رہا تھا وہ کسی قبرستان میں داخل ہو رہی ہے۔

'کون؟' ایک نحیف سی آواز عقب سے آئی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ چھڑی کی مدد سے رستہ ٹٹولتے ہوئے جمن بابا اس کے قریب آ گئے۔

'جمن بابا۔' وہ بے اختیار رو پڑی۔ 'میں ہوں ایمن۔'

'بی بی صاحب؟ کیا کروں نظر کمزور ہو گئی ہے کچھ سوجھتا نہیں۔'

'نظر ٹھیک بھی ہوتی تو بھی آپ مجھے پہچانتے نہیں۔' وہ گلوگیر لہجے میں بولی۔

'ہاں۔ وقت بہت گزر گیا ہے ناں۔ آپ نے بہت دیر کر دی بیٹا۔ سب کچھ ختم ہو گیا۔'

'جانتی ہوں۔' اس کا دل پھٹنے لگا تھا۔ 'سلطان کہاں ہیں؟' وہ بے قراری سے بولی۔

'وہ تو ولایت چلے گئے۔'

'کب؟' بے تحاشہ چونکی تھی وہ۔

'یہی کوئی ڈھائی تین برس ہوئے۔ بیچ میں ایک بار آئے تھے اپنی میم کے ساتھ۔ شادی کر لی نا وہاں۔' وہ تفصیل بتانے لگے۔ 'پھر ساتھ میں اپنی ماں کو بھی لے گئے۔' وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے انھیں دیکھ رہی تھی۔

'جاتے وقت کہہ گئے تھے کہ اس حویلی سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ آپ اس کی دیکھ بھال کیجیے۔ کبھی ایمن آئے تو اس کے حوالے کر دیجیے گا۔' بتاتے ہوئے جمن بابا کی آنکھیں بھیگنے لگی تھیں۔

'بہت دیر سوئی میں۔' وہ جیسے خود سے کہتے ہوئے آگے بڑھنے لگی اور جمن بابا اپنی جھکی ہوئی کمر پر ہاتھ رکھ کر اس کے ہمراہ چل دیے۔ وہ درد کا طوفان سمیٹے آندھیوں کے تھپیڑے کھاتی بے دم سی گرد آلود صوفے پر بیٹھ گئی۔ جمن بابا اس سے جانے کیا کیا کہہ کر جا چکے تھے اور وہ اس طرح بے حس و حرکت بیٹھی تھی جیسے اب چلنے کی قوت جواب دے چکی ہو اور ابھی اسے زندگی کے ناہموار راستوں پر تنہا چلنا تھا۔ بالکل تنہا۔

□□□

Tahseen Kazmi
C/o. S. Gulzar Husain Kazmi
Mirza International Ltd.
C/o. Kisan Transport Co.
Near Purani Chungi
Buland Shahar Road, Hapur-245408 (U.P)

ڈاکٹر شہناز یوسف

باس

نرل نے گھر میں قدم رکھتے ہی کتابوں سے بھرے بیگ کو زور سے زمین پر پھینک دیا۔ اُس کا چہرہ آفتاب کی مانند آگ اُگل رہا تھا، جس کا احساس گھر کے دوسرے کمرے میں کام کر رہی ماں کو ہوگیا۔ ''ارے بابو، تو آگیو۔ اِتو غصہ میں کیوں ہے، کئی بات وی چھورا''۔

زمین پر بکھری کتابوں پر نظر ڈالتے ہوئے روپا نے پوچھا۔

نرل نے ماں کی بات پر توجہ دیے بغیر اپنی پتلون سے لگے بیلٹ کو زور سے کھینچتے ہوئے زمین پر مارا اور چلایا۔ ''ساری دنیا کی صفائی کا ٹھیکہ کیا ہم نے ہی لیا ہے''۔ نرل کی زبان سے ایسے الفاظ سن کر روپا حیرت زدہ رہ گئی۔ وہ کچھ سمجھتی اُس سے قبل ہی نرل آندھی کی مانند گھر سے باہر چلا گیا۔ یکا یک ماحول میں خاموشی طاری ہوگئی۔

روپا نے پہلی دفعہ نرل کا یہ روپ دیکھا تھا۔ دراصل نرل بے حد مہذب اور فرماں بردار بچہ تھا۔ روشن جبیں، اونچا قد، پُرتاب آنکھیں، غرض کہ اُس میں تمام صفات موجود تھیں۔ جب بھی اسکول میں ٹائی بیلٹ لگا کر جاتا تو سچ مچ راجا بابو لگتا۔ تبھی تو روپا اُسے محبت سے ''بابو'' کہہ کر پکارتی۔ پڑھائی میں ہمیشہ اوّل آتا، باوجود اکلوتی اولاد ہونے کے اُس میں ضد، غصہ اور شرارت کی جگہ شائستگی، ادب اور صبر و تحمل کا وسیع دریا ہلورے لے رہا تھا۔ اُس کے خوش نما مزاج کے سبب ہی وہ سب کے دلوں میں خاص جگہ بنا چکا تھا۔ پر آج اُس کی اس عجیب حرکت اور غصّے کو دیکھ کر روپا حیران تھی۔

روپا کشمکش کے عالم میں ادھر اُدھر ٹہل رہی تھی۔ اُس کے دل میں مختلف قسم کے خیالات اپنی جگہ مستحکم کرنے کی کوشش میں سرگرداں تھے۔ کچھ ہی دیر کے بعد پرکاش گھر میں داخل ہوا۔

''اری روپا'' تو شرما جی کے گھرے نی گئی، وئے کوڑا کو ڈھیر جیوں کو تیوں پڑو ہے''۔

پرکاش نے روپا کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے ہاتھ میں پکڑا جھاڑو، نالی صاف کرنے کا کھرپا اور کچرے کی گاڑی کو بڑے سلیقے سے دیوار کے پاس ہی اُس جگہ پر کھڑا کر دیا جو اس کے لیے طے کی گئی تھی۔ روپا کی خاموشی کو پرکاش لمحہ بھر میں سمجھ گیا اور بولا

''نرل کتّے ہے، دکھائی نی دے ریو''۔

روپا نے پل بھر کے اُس عجیب منظر کو پرکاش کے سامنے پیش کر دیا۔ روپا کی باتیں سن کر پرکاش کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ روپا کی آنکھیں پرکاش سے سوال کر رہی تھیں۔ پرکاش نے نظریں جھکا لیں۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد پرکاش نے جواب دیا

''آج مو نرل کے اسکول کے بار نو نکل ری گٹر صاف کر ریو تھو''۔

پرکاش نے اتنا کہہ کر اپنی گھٹی ہوئی سانسوں کو اس طرح چھوڑا جیسے کوئی مضبوطی سے تھامے اُمید کے دامن کو آہستہ سے چھوڑ دیتا ہے۔ اس کے آگے نہ پرکاش نے کچھ کہا اور نہ روپا نے کچھ پوچھا۔

شام کی آمد نے سورج کی گرمی کو ٹھنڈا کر دیا۔ آسمان کی سُرخی اور پرندوں کی چہچہاہٹ راہ گیر کے گھر لوٹنے کا اشارہ کر رہی تھی۔ روپا کی آنکھیں دہلیز پر آہٹ کی اُمید لگائے ٹکی تھی کہ تبھی نرل افسردہ چہرہ لیے گھر

میں داخل ہوا۔دونوں کی طرف دیکھے بغیر ہی وہ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

کئی سال گزر گئے۔نرمل ایک کے بعد ایک کامیابی حاصل کرتا رہا جس میں اُس کے والد کے بدبودار ہاتھوں ,غلیظ جسم اور پسینے کی کمائی کا بڑا اہم رول رہا۔اس درمیان کئی دفعہ نرمل اور پرکاش میں بحث ہوئی۔جہاں نرمل اس کام سے اپنے والدین کو دور رہنے کا فرمان سناتا رہا وہیں پرکاش نے بھی اپنے اور اپنے کام کو کم تر نہ سمجھتے ہوئے بدستور جاری رکھا۔غرض کہ ایک روز دو فکر کے درمیان ہوئے اختلاف کی گونج نے رشتوں میں مزید کڑواہٹ پیدا کر دی۔آخر دونوں نے اپنی راہیں الگ کر لیں

پرکاش بیٹے کی مایوسی کو دور کرنے کے ارادے سے کمرے کی طرف بڑھا۔والد کو دیکھتے ہی نرمل کو وہ بدبودار گٹر اور اُس کی گندگی میں پوری طرح ڈوبے ہوئے اپنے والد کی وہ تصویر یاد آ گئی جس نے اُسے آج پہلی مرتبہ اپنے دوستوں کے سامنے شرمندہ کر دیا۔وہ بدبو اُس کے دماغ میں اس طرح بس چکی تھی کہ اُسی دم اُس نے اُبکائی لینا شروع کر دیا اور چلایا ''دور جاؤ، مجھے باس آ رہی ہے''۔نرمل کی بات نے جیسے پرکاش کے جسم پر ہزاروں ہتھوڑے چلا دیے۔پرکاش فوراً باہر نکل گیا۔اُس کی آنکھیں اشکبار تھیں۔

روپا کچھ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔نرمل اپنی ذات اور اپنے والدین کے کام سے بخوبی واقف تھا۔اچھے اسکول میں اُس کا داخلہ کراتے وقت ہی روپا کو اس بات کا ڈر تھا کہ کہیں نرمل خود کو کم تر محسوس نہ کرے لیکن نرمل کی خوش دلی اور حاضر دماغی نے اُسے سب کا چہیتا بنا دیا تھا۔روپا نرمل کو پڑھا لکھا کر بڑا آدمی بنانے کے خواب دیکھنے لگی تھی ۔لیکن نرمل کی ایک حرکت نے سب کچھ بدل دیا۔اس کے ذریعے کی گئی اپنے والد کی توہین نے باپ بیٹے کے درمیان ایک ایسا خلا پیدا کر دیا جس کو نہ وقت ختم کر سکا اور نہ روپا۔

کئی سال گزر گئے۔نرمل ایک کے بعد ایک کامیابی حاصل کرتا رہا جس میں اُس کے والد کے بدبودار ہاتھوں ،غلیظ جسم اور پسینے کی کمائی کا بڑا اہم رول رہا۔اس درمیان کئی دفعہ نرمل اور پرکاش میں بحث ہوئی۔جہاں نرمل اس کام سے اپنے والدین کو دور رہنے کا فرمان سناتا رہا وہیں پرکاش نے بھی اپنے اور اپنے کام کو کم تر نہ سمجھتے ہوئے بدستور جاری رکھا۔غرض کہ ایک روز دو فکر کے درمیان ہوئے اختلاف کی گونج نے رشتوں میں مزید کڑواہٹ پیدا کر دی۔آخر دونوں نے اپنی راہیں الگ کر لیں۔

''ماں، کہاں ہو تم''۔نرمل خوشی کے سبب چہک سا رہا تھا۔بیٹے کی آواز میں خوشی کی کھنک سُن روپا جلدی سے باہر آئی۔

''کیا ہوا بابو''۔نرمل کے پاس آ کر روپا نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔نرمل نے ماں کا منہ میٹھا کراتے ہوئے کہا''ماں میرا پی ایچ ڈی میں داخلہ ہو گیا ہے۔تجھے معلوم ہے، یہ سب سے بڑی ڈگری ہوتی ہے۔دیکھنا اب میں اتنی شدت کے ساتھ کام کروں گا کہ تحقیق کے میدان میں میرا بھی نام عزت کے ساتھ لیا جائے گا''۔آج نرمل کے چہرے پر خوشی و غم کے ملے جلے اثرات دکھائی دے رہے تھے۔

نرمل اور روپا کو خوشی میں جھومتے دیکھ پرکاش سے صبر نہیں ہوا۔وہ جلدی سے اپنے ہاتھوں میں سلگ رہی بیڑی کو بجھا کر کمرے میں داخل ہوا۔نرمل نے اپنی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے الجھن میں مبتلا اپنے والد کا بھی آشیرواد لیا اور اُن کا منہ میٹھا کرانے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔والد نے بیٹے کی خوشی میں شرکت کی اور اُسے دعائیں دی۔آج سالوں کے بعد پرکاش نے نرمل کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

''کِتنا روپیہ کو خرچ ہوئے گوای پڑائی میں''۔

والد کے اس سوال پر نرمل ہنس پڑا''کوئی خرچ نہیں ہوگا بابا، مجھے اسکالرشپ ملی ہے، سرکار ہی میری پڑھائی کا سارا خرچ اُٹھائے گی''۔اصل میں نرمل نے نیٹ جے آر ایف کا امتحان پاس کر لیا تھا وہ بھی جنرل کوٹے سے۔یہ کالج کا پہلا واقعہ تھا جہاں کوئی نچلے طبقے کے طالب علم نے بغیر کسی ذاتی فائدہ کے خود کی ذہانت کو اس طرح ثابت کیا تھا۔ریزرویشن کے نام پر ہر وقت اُس کی علمی کاوشوں کو کم تر ماننے والوں کو نرمل نے منہ توڑ جواب دیتے ہوئے پی ایچ ڈی کے انٹرنس میں بھی خود کو اوّل درجے پر مستقیم کیا۔اُس کی کامیابی اُس کی اہلیت کا ثبوت تھی۔بیٹے کی کامیابی نے پرکاش کی ناراضگی کو جیسے کافور کر دیا۔ایک لمحے میں برسوں کی کڑواہٹ ختم سی ہوتی دکھائی دینے لگی۔حالانکہ برسوں قبل کے اُس واقعے نے دونوں کے درمیان فرق پیدا کر دیا تھا لیکن آج نرمل کے خوشی بھرے لمحات میں ایک باپ اپنی ہتک بھول کر اُس کی خوشی میں شرکت کر رہا تھا۔

اصل میں شرما سر کئی دفع اپنی گھڑی کو گھور چکے تھے لیکن نرمل کے ذریعے اُن کے اشارے کو نہ سمجھ پانے پر اُنھوں نے سیدھے ہی اُسے دوسرے دن آنے کا حکم دیا۔نرمل نے ایک اچھے طالب علم کی مانند اُن کے حکم کی تعمیل کی اور اجازت لے کر کمرے کے باھر آ گیا۔اپنی گاڑی کے قریب پہنچ کر اُسے یاد آیا کہ چابی تو وہ سر کے کمرے میں ہی بھول آیا ہے۔وہ دوبارہ سر کے کمرے کی طرف بڑھا۔ نزدیک پہنچا ہی تھا کہ کچھ الفاظ سن کر وہ حیران رہ گیا

''ماں، میں یونیورسٹی جارہا ہوں''۔ پرکاش بخوشی گھر سے یونیورسٹی کے لیے روانہ ہوا۔

یونیورسٹی کے سائنسی شعبہ کے سب سے بزرگ اور شہرت یافتہ پروفیسر سریندر شرما کا بطور نگراں نرمل نے انتخاب کیا۔ اکتشافاتِ جدیدہ میں اُن کا اہم نام تھا۔ نرمل سر کو اپنا آئیڈیل مانتا تھا۔ نئے خیالات، نئی فکر، نئے دلائل، نئے ثبوت اور سینکڑوں ریسرچ پیپرس پروفیسر شرما کی علمی خوبیوں اور تحقیق کے میدان میں اُن کے اہم مقام کا ثبوت دیتے تھے۔

''ارے نرمل، کم ان''۔ نرمل کو دروازے پر کھڑا دیکھ کر شرما سر نے اُسے اندر آنے کی اجازت دی۔ نرمل نے کمرے میں داخل ہوتے ہی اپنے ہاتھ استاد کے قدموں کی طرف بڑھائے ہی تھے کہ انھوں نے روک دیا۔

''ارے بھائی نرمل، اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ بیٹھو''۔

نرمل نے اپنے ساتھ لائی مٹھائی کے ڈبے کو بڑے ادب کے ساتھ سر کی طرف بڑھا دیا۔ شرما سر نے نرمل کو کام میں مصروف ہونے کا اشارہ کرتے ہوئے مٹھائی ٹیبل پر رکھ دینے کا اشارہ کیا۔

نرمل کے چہرے پر عجیب سی مسرت تھی۔ شرما سر اپنی نظریں ٹیبل پر جمے کئی کاغذات میں اُلجھائے ہوئے تھے اور نرمل ایک ایسی ان دیکھی تحقیقی دنیا میں کھو چکا تھا جہاں کئی نئی تکنیک، تجربے، زاویے اور اُن کے مرتب اثرات رونما ہو رہے تھے۔ نرمل مسلسل اپنے خیالات کی دنیا کے ایک ایک حصے سے اپنے استاد کو روبرو کرانے میں مشغول تھا کہ تبھی سریندر سر نے اُسے روکا۔

''نرمل ابھی میری ضروری میٹنگ ہے۔ تم کل صبح 10 بجے آ جاؤ۔ جو بھی موضوع ذہن میں ہے اُس پر پڑھ کر آؤ پھر بات کرتے ہیں''۔

اصل میں شرما سر کئی دفع اپنی گھڑی کو گھور چکے تھے لیکن نرمل کے ذریعے اُن کے اشارے کو نہ سمجھ پانے پر اُنھوں نے سیدھے ہی اُسے دوسرے دن آنے کا حکم دیا۔ نرمل نے ایک اچھے طالب علم کی مانند اُن کے حکم کی تعمیل کی اور اجازت لے کر کمرے کے باہر آ گیا۔ اپنی گاڑی کے قریب پہنچ کر اُسے یاد آیا کہ چابی تو وہ سر کے کمرے میں ہی بھول آیا ہے۔ وہ دوبارہ سر کے کمرے کی طرف بڑھا۔ نزدیک پہنچا ہی تھا کہ کچھ الفاظ سن کر وہ حیران رہ گیا۔

''ارے شنکر، اس مٹھائی کو ہٹا یہاں سے اور ٹیبل کو کپڑے سے صاف کر''۔ شرما سر منھ بناتے ہوئے چپراسی کو حکم دے رہے تھے۔ یہ منظر دیکھ کر نرمل کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ نرمل ٹوٹ سا گیا۔

گھر کے راستے کا سفر اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے ہر قدم پر ہزاروں کانٹے اُس کے جسم پر ہی نہیں بلکہ اُس کے ضمیر پر بھی چبھ رہے ہوں۔

کالج سے گھر کا سفر تمام پرانی یادوں کو اپنے ساتھ سمیٹ لایا۔ اپنے والد سے بڑھتی دوری، اپنی ذات کو اور اُس سے وابستہ کام کو کم تر سمجھنا اور خود کو احساسِ کمتری سے محفوظ رکھنے کے لیے اُس کی جی توڑ محنت غرض کہ ایک کے بعد ایک بدلتی صورتِ حال کی ہر چھوٹی تصویر نرمل کے ذہن میں نمودار ہونے لگی۔ مختلف خیالات میں ڈوبے نرمل کو اچانک سڑک کے کنارے ایک گٹر کے نزدیک کھڑے اپنے والد دکھائی دیے جو اُس کی صفائی کرنے کی خاطر اپنی پتلون اوپر چڑھا رہے تھے۔ نرمل نے گاڑی کو اُن کے نزدیک لا کر روک دیا۔ پرکاش نرمل کو ایسے اچانک اپنے سامنے دیکھ کر چونک گیا۔ گٹر کی بدبو پوری فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔ پرکاش کچھ سمجھ پاتا اُس سے قبل ہی نرمل نے گٹر میں چھلانگ لگا دی۔

□□□

Dr. Shahnaz Yusuf
528/33
Chipa Colony
OTC Scheme
Mallatalai
Udaipur-313001 (Rajasthan)

ڈاکٹر فرحت نادر رضوی

دھندا

نہانے کے لیے شرٹ اتار کر وہ نل کے نیچے بیٹھنے ہی جا رہا تھا کہ ٹریفک سگنل ریڈ ہو گیا۔ وہ تیزی سے اپنا جھاڑن اٹھا کر لپکا اور گاڑیوں کے شیشے صاف کرنے لگا۔ ایک کے پیچھے ایک قطار سے لگی ہوئی گاڑیوں کے شیشے گہرے کُہرا کی وجہ سے دھندلے تھے وہ حسب معمول تیزی سے ہاتھ چلاتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔

یہ لے پیسے، اس نے دانت نکالتے ہوئے اپنی نکر کی دونوں پاکٹ باہر کی طرف پلٹ دی۔

ارے...... اتنے پیسے...... دونوں بہنوں اور ماں کے منہ سے تحیر اور خوشی کے مارے چیخ نکل گئی۔

مجھے تو کسی نے نہیں دیے۔ چھٹکی کو سچ میں بہت غصہ آیا مگر آج تجھے اتنے پیسے مل کیسے گئے رے؟ بڑی نے حیرت سے آنکھیں پھاڑیں۔

پتہ نہیں...... اس نے بے خیالی سے کہا اور نہانے کے لیے ٹنکی کے پاس والی نل کی ٹونٹی کے نیچے بیٹھ گیا۔

ماں خاموشی سے کلوا کی ابھری ہوئی پسلیوں پر پڑنے والی پانی کی بوچھاروں کو دیکھتی رہی...... کلوا نل کے تازہ تازہ پانی سے نہاتے ہوئے بھی کٹکٹا رہا تھا ہوا جو ایسی سرد چل رہی تھی، کلوا کی پسلیاں تیز تیز سانس لینے کی وجہ سے اور زیادہ ابھر آئی تھیں، ماں کے ہونٹوں پر ایک گہری مسکراہٹ دوڑ گئی۔

اگلے دن ٹریفک سگنل پر جاتے ہوئے ماں نے کلوا کی شرٹ اتروا دی۔

ارے اماں...... کیا کرتی ہے، مجھے ٹھنڈ لگ رہی ہے۔

ارے تو کیا ہوا! ذرا دیر میں واپس آ کے ابھی پہن تو لے گا تو...... ابھی جا ایسے ہی۔

ارے باپ رے...... بڑی سردی ہے، کلوا کی سانس ٹھنڈ کی وجہ سے تیز تیز چلنے لگی، اور اس کی پسلیوں کی ایک ایک ہڈیاں الگ الگ دکھائی دینے لگیں۔

مگر حسب معمول کلوا کا ہاتھ گاڑیوں کے شیشے پر چلتا رہا یہ لے پیسے...... آج پھر کلوا کی کمائی بڑی اور چھٹکی سے زیادہ تھی۔

ماں نے کلوا کو الگ سے دو انڈے ابال کر کھلائے اور بڑی سے کہہ کر اس کے سر میں سرسوں کا تیل بھی لگوایا۔ کلوا کی تو قسمت ہی کھل گئی۔ نواب کی طرح گدڑی کے اندر بیٹھا انڈے کھاتا رہا اور چھٹکی دور سے حسد بھری نگاہ سے اس کو دیکھتی رہی۔ دوسرے انڈے کا آخری ٹکڑا اس نے بڑی شان بے نیازی سے چھٹکی کی طرف بڑھا دیا۔

یہ لے...... تو بھی کھا لے، اور چھٹکی حریص کی طرح لپکی اور ایک ہی بار میں پورا ٹکڑا منہ میں رکھ لیا۔

ہونہہ...... تیل لگوائے گا ہم سے اور انڈا کھلائے گا چھٹکی کو...... چل ہٹ...... میں نہیں لگاتی تیل ویل تجھے۔

بڑی نے بھنا کر کلوا کے الجھے الجھے سخت بال مٹھی میں جکڑ لیے ہاں ماں دیکھ...... یہ میرے بال نوچتی ہے۔ وہ بلبلا کر چلایا۔ مگر ماں تو پیسے کی گرمی سے اپنی گدڑی میں کب کی سکون سے سو چکی تھی۔

اب وہ ہر روز شرٹ اتار کر ہی ٹریفک سگنل پر جایا کرتا تھا۔ کمائی بھی اچھی ہوتی اور ماں کھانے کو بھی اچھا اور زیادہ دیتی۔ رات میں بڑی سے کہہ کر سر میں سرسوں کا تیل بھی لگواتی۔

وہ بہت خوش تھا۔ اب وہ ایک طرح سے اس مختصر سے کنبے کا سردار بن گیا تھا۔ چھٹکی بھی اس کی خوشامد میں رہتی اور بڑی بھی اس کے آگے پیچھے پھرتی۔ وہ دونوں بہنیں ٹریفک سگنل اور بائیک والی لین میں پھول بیچا کرتی تھیں جنھیں شاذ و نادر ہی کوئی لیتا ایسے میں پاکٹ منی کے طور پر کبھی دو اور کبھی پانچ روپے کلوا کی طرف سے انھیں مل ہی جاتے، جنھیں ماں کی آنکھوں سے بچا کر یہ تینوں بلیا پار والی نتھو حلوائی کی چائے کی دوکان پر سموسے کھا کر صرف کرتے اور یہ کسی پیزا ہٹ اور مک ڈونالڈ برگر کی ٹریٹ سے کسی بھی طرح ان کے لیے کم مسرت انگیز نہ ہوتا۔

صبح سے سردی کی شدت کے ساتھ ہلکی ہلکی پھواریں بھی پڑنی شروع ہو گئی تھیں۔ شام ہوتے ہوتے بارش تھمی مگر کہرا بہت گہرا ہو گیا۔ ساری رات گاڑیاں بہت سست رفتاری سے چلیں۔ سڑک پر بہت لمبا جام لگا رہا۔ جام کی بھی اپنی افادیت تھی۔ ساری رات کلوا کام پر لگا رہا...... اس

کی پسلی کی ہڈیاں جب سردی میں کپکپاتیں تو ایئر کنڈیشنڈ گاڑیوں کے شیشے گرنے لگتے۔ بہت سے لوگ تو بجائے دس بیس کے سوسو اور دو دو سو کے نوٹ دے جاتے اور کچھ اس کی بے بسی اور عریانی دیکھ کر اپنی شال یا سوئیٹر تک دینے پر آمادہ نظر آتے۔

مگر انھیں میں کئی ایسے بھی تھے جو تضحیک آمیز لہجے میں میں کہتے۔ ہونہہ سالا ٹوٹنکی کرتا ہے۔ سب ڈرامہ ہے...... پیسہ کمانے کا دھندا ہے سالے کا...... کپڑے ہی نہیں ہیں جیسے اس کے پاس، بھاگ یہاں سے۔

کلوا کو بہت غصہ آتا۔ کپڑے تھے تو اس کے پاس پر ماں ہی ننگا کر کے بھیجتی تھی اس کو، اور وہ سردی میں کڑکڑا تا رہ جاتا تھا۔ اس پر سے پیسے بھی نہیں ملتے تھے اور گالی الگ ملتی...... تو اس کا خون کھول کر رہ جاتا مگر یہ ساری کدورت دو گرم گرم انڈوں سے ملنے والی فرحت کے احساس تلے کہیں گم ہو جاتی اور وہ سر جھٹک کر دوسری گاڑیوں کی جانب متوجہ ہو جاتا۔

عموماً کمسن لڑکیاں اس پر زیادہ مہربان ہوتیں۔ کچھ تو اس کی حالت پر آبدیدہ بھی ہو جاتیں۔ یہ سب اسے بیچ میں بہت اچھا لگنے لگا تھا...... اسے لگتا وہ کلوا نہیں کوئی ہیرو ہے اور یہ میم اس کی ہیروئن، جو اس کے دکھ سے دکھی ہو کر رو رہی ہے اور اس کی رگوں میں چنگاریاں سی دوڑنے لگتیں۔

آج کلوا کو بہت چھینکیں آئیں اور پھر آنکھ سے پانی اور ناک سے لعاب بھی جاری ہو گیا۔ آج سردی بھی تو بہت زیادہ تھی۔ مسلسل کئی دنوں سے سورج بھی نہیں نکلا تھا۔ گہری دھند کی چادر نے ماحول کو سرد کر رکھا تھا۔ ٹریفک جام کی وجہ سے سڑک پر مسلسل ہارن بج رہے تھے۔ مگر کلوا اپنی گدڑی میں ڈبکا پڑا تھا۔ چھٹکی نے کئی بار اسے ہلایا بھی مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ آخر ماں کو جھاڑو بنانے کا کام چھوڑ کر آنا پڑا۔

کلوا...... او کلوا ارے جانا...... لمبا جام لگا ہے...... جا...... جلدی جا

اماں آج چھوڑ دے بہت ٹھنڈ لگ رہی ہے۔ کلوا کسمنایا۔ ارے جانا...... جا جلدی، آج میں تجھے گرما گرم جلیبی منگا دوں گی جا کلوا......

جلیبی کے نام پر کلوا کے ست بدن میں جان آ گئی۔ وہ اٹھ بیٹھا مگر اماں شرٹ نہیں اتاروں گا۔

ارے پاگل! شرٹ نہیں اتارے گا تو کیا ملے گا تجھے۔ جا جا...... اماں نے کھینچ کر اسے گدڑی سے نکالا اور بڑی بے دردی سے اس کی شرٹ اتار کر اسے بھگا دیا۔

اچانک گرم سے ٹھنڈے میں آنے پر کلوا کے جسم پر ایک دم سے رعشہ طاری ہو گیا۔ دانت کٹکٹانے لگے اور زور کی کھانسی اٹھی...... کلوا کھانستے کھانستے دوہرا ہو گیا اور اس کی سانسیں اکھڑ گئیں۔ چھٹکی سڑک کے دوسری جانب پھول بیچ رہی تھی سڑک پر پھول کی ٹوکری پھینک کر دوڑی...... کلوا کی پیٹھ سہلائی...... یہ سارا تماشا سڑک کے کنارے ہو رہا تھا۔ ایک سیاہ رنگ کی لمبی سی گاڑی بالکل پاس آ کر رکی گاڑی کا شیشہ اترا اور دو ہزار کا نوٹ کسی نے کلوا کے سامنے ڈال دیا۔ کلوا نے ہاتھ کو دیکھا۔ نہایت گوری گوری خوبصورت کلائی میں سونے کے کڑے جگمگا رہے تھے نازک لمبی لمبی انگلیوں میں خوبصورت نگینے کی انگوٹھیاں...... کلوا نے نظروں سے ہاتھوں کے بوسے لیے، مگر ہاتھ فوراً ہی غائب ہو گیا...... کلوا پر ایک بار پھر کھانسی کا دورہ پڑا، چھٹکی نے کلوا کو کسی طرح گھسیٹا اور دو ہزار کے نوٹ کے ساتھ ماں کے سامنے پہنچی......

ماں ماں...... یہ دیکھو آج دو ہزار ملا ہے۔ چھٹکی خوشی اور جوش سے چلا کر بولی۔

اور وہ بھی ایک ہی میم سے...... بڑی اچھی تھی جی۔

تو نے اسے دیکھا تھا......؟ کلوا کی کھانسی تھم سی گئی۔

اور کیا...... بہت خوبصورت تھی، چھٹکی اترائی۔

میں نے تو بس ہاتھ دیکھے تھے۔ وہ بھی ذرا دیر کو...... کلوا کو پھر کھانسی اٹھ گئی۔

ماں پیسے لے کر اندر رکھنے چلی گئی اور شاید کلوا کو شرٹ پہنانا بھول گئی۔ چھٹکی پھولوں کی ٹوکری واپس اٹھانے چلی گئی، بڑکی اپنا کمیشن لینے آئی تھی مگر کلوا کھانس کھانس کر ادھ موا ہو رہا تھا۔ بڑکی نے کلوا کو اکیلے ہی اٹھایا اور کھینچ کر اندر لائی۔ دبلا پتلا تھا تو کیا ہوا تھا تو پھر لڑکا...... بڑکی اسے کھینچنے میں ہانپ گئی۔ کسی طرح اسے گدڑی میں گھسایا اور بغیر سر میں تیل ڈالے ہی واپس بھاگی۔ آج اسے اپنا پاکٹ منی خود ہی کمانا تھا۔

رات بھر سڑک پر رہ رہ کے جام لگتا رہا۔ لڑکیاں پھول بیچتی رہ گئیں۔ پلاسٹک کی کالی کالی شیٹس اور دفتی سے بنائے ہوئے اس جھگی نما سائبان میں آج رات سردی بھی بہت زیادہ تھی۔ ماں بھی لڑکیوں کی وجہ سے سڑک پر ہی بیٹھی رہ گئی۔ صبح تک کہیں جا کر جام ختم ہوا۔ لڑکیوں کی ڈیوٹی ختم ہوئی تو ماں نے چائے بنائی اور آج ایک ساتھ چھ انڈے بھی ابالے کیونکہ آج رات لڑکیوں نے بھی کمائی کی تھی۔ چھٹکی کو دوڑا کر گرما گرم جلیبیاں بھی منگوائیں۔ ابھی تو اسے پیسے بھی گننے تھے۔ اگر پیسے پورے پڑ گئے تو آج ہی وہ رضائی خریدے گی اور وہ بھی دو ایک تو کلوا کے لیے اور دوسری میں بڑکی چھٹکی اور وہ خود۔ اور ہاں...... اس پلاسٹک کے گھر کی جگہ ایک پھونس کے چھپر اور دیوار والا گھر بھی بنانا ہے، جس کی دیواریں سردی کی تیز

ہواؤں میں پتے کی طرح اڑیں نہیں...... سردی جان مارے ہوئے تھی۔

چائے اور انڈے لے کر بڑکی کلوا کے پاس آئی۔ حسب معمول سرسوں تیل کی شیشی بھی اس نے ہاتھ میں اٹھائی تھی...... کلوا ارے او کلوا...... چائے پی لے، مگر کلوا نہیں اٹھا۔ اماں دیکھ...... کلوا تو بہت گہری نیند سو رہا ہے، چھوڑ دے سونے دے۔ جلیبی ہم لوگ کھا لیتے ہیں۔ اٹھے گا تو دوبارہ منگوا دینا۔

چپ، اٹھا ٹھیک ہے...... پیسے کا پیڑ نہیں لگا ہے کہ دوبارہ جلیبی آئے گی۔

اے کلوا اٹھ...... اٹھ جلدی، دیکھ گرما گرم جلیبی، چھٹکی نے بدمعاشی میں جلیبی اس کی ناک سے لگا دی۔ کلوا کے جسم میں جلیبی کی خوشبو سے حرارت دوڑ گئی۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ مگر اس کی آنکھیں غیر معمولی طور پر سرخ تھیں۔ بڑکی نے تیل لگایا تو کلوا کا ماتھا دہک رہا تھا...... اس کی کراہیں سن کر ماں بھی آ گئی۔

کلوا کی حالت بہت زیادہ خراب تھی سرکاری ہاسپٹل سے جواب مل گیا تو ماں اسے لے کر پرائیویٹ میں بھاگی۔ کولڈ اسٹروک ہوا تھا۔ ابتدائی چوبیس گھنٹوں میں رکھے سینتے ہوئے سارے پیسے ختم ہو گئے۔ ماں کلوا کو لے کر اسپتال میں تھی جبکہ چھٹکی گھر پر۔ بڑکی گھر اور اسپتال کے بیچ دوڑ رہی تھی۔

اسپتال میں اور پیسے مانگے گئے ہیں، بڑکی نے چھٹکی سے کہا۔ کلوا کیسا ہے...... چھٹکی نے پوچھا۔

کیوں......؟

ارے کلوا اگر آ جائے تو فوراً پیسے بھی آ جائیں گے۔ تجھے پتہ ہے...... اس دن جو کلوا کو کھانسی اٹھی تھی اس دن ایک بار میں اسے دو ہزار ملے تھے...... ہاں...... وہ تو ہے۔ بڑکی نے سر ہلایا...... پر کلوا کو تو سدھ ہی نہیں ہے۔ میں نے شیشے والے کمرے میں جھانک کر دیکھا تھا۔ اس کے منہ اور ناک پر ماسک لگا ہوا اور وہ بڑی زور زور سے سانس لے رہا تھا۔

تب تو اور بھی پیسے ملیں گے۔ چھٹکی نے خوش ہو کر کہا۔

چپ رہ...... بڑکی جھلا گئی۔

تو اب پیسے کہاں سے آئیں گے؟ کلوا تو وہاں ہے، چھٹکی نے فکر مندی سے پوچھا۔

مگر بڑکی خاموشی سے سر جھکائے تنکے سے فٹ پاتھ پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچتی رہی۔

سن نا...... کیوں نہ میں پیسے مانگوں چھٹکی کے دماغ میں ایک شاندار آئیڈیا آیا۔

چپ رہ پاگل بڑکی نے اسے زور سے دو تھپڑ جڑے وہ زور زور سے رونے لگی۔

آج تو ماں بھی نہیں تھی جس سے شکایت کرتی۔

کچھ دیر تک بڑکی سر جھکائے سوچتی رہی پھر اس نے یکلخت سر اٹھایا۔

سن چھٹکی...... تو بس یہیں رہنا...... میں پلیاں پار والے چائے خانے جا رہی ہوں۔

کیوں......؟

تیرے لیے سموسہ لانے۔

پر پیسے کہاں ہیں تیرے پاس؟ مگر ہاں...... تجھے تو سموسے والے حلوائی چاچا ہمیشہ اپنی طرف سے دو سموسے کھلاتے ہیں۔ تو جائے گی تو پیسے نہیں مانگیں گے وہ ہاں...... چھٹکی...... اب چپ ہو جا...... رو مت، تجھے بھوک لگی ہے نا؟ ہاں......

تو تو بس یہیں بیٹھ...... میں سموسے لاتی ہوں۔

آدھے گھنٹے بعد بڑکی نے چھٹکی کو دو سموسے دیے اور ہاسپٹل بھاگی۔ اس کے ہاتھ میں دو ہزار کا نوٹ تھا جسے وہ جلد از جلد ماں کو دینا چاہتی تھی۔ اس نے سنا تھا وہاں کوئی ماں سے کہہ رہا تھا کہ شیشے والے کمرے کا کرایہ بہت زیادہ ہے۔ اسی میں رکھنے سے کلوا بچا ہے ورنہ مر جاتا۔ اگر اس کے پیسے نہیں دیے تو کلوا کو اس میں سے نکال دیں گے۔

وہ بھاگی بھاگی شیشے والے کمرے کی طرف گئی...... مگر وہاں تو کوئی نہ تھا۔ اس نے ماں کو ڈھونڈا مگر وہ بھی نہ ملی...... کاؤنٹر سے بس یہ پتہ چلا کہ وہ واپس چلی گئی۔ وہ بھاگی ہوئی گھر لوٹی۔ گھر میں بھی کوئی نہ تھا۔ وہ چھٹکی کو ڈھونڈتی ہوئی ہائتک والی لین کی طرف پہنچی جہاں وہ پھول بیچا کرتی تھی وہاں چھٹکی اور ماں کو روپے گننے میں مصروف پایا۔ بورے پر ایک چیتھڑے سے ڈھکی ہوئی کلوا کی لاش پڑی تھی جس کا صرف چہرہ کھلا تھا۔ ہر جانے والا لاش پر کچھ نہ کچھ پیسے پھینک رہا تھا۔

□□□

Dr. Farhat Nadir Rizvi
Abul Fazal Enclave
Thokar No. 6, Gali No. 22
Allama Shibli Nomani Road
Shaheen Bagh, New Delhi-110025

زینت دہلوی

غزلیں

پرسکون دل میرا بے قرار رہتا ہے
کون ہے مجھے جس کا انتظار رہتا ہے

گرمیاں لحافوں کی کارگر نہیں ہوتیں
جسم کی حرارت میں اک شرار رہتا ہے

بھیگے بھیگے تکیوں نے راز یہ کیا افشا
خشک خشک آنکھوں میں آبشار رہتا ہے

تیرا نام سینے پر میں نے لکھ لیا خود ہی
اس طرح محبت کا اعتبار رہتا ہے

ہجر نے بنا ڈالا ماہر مہ و انجم
اک اک ستارے کا اب شمار رہتا ہے

ہوش ہے کہاں مجھ کو دامن و دوپٹے کا
اس کا بھی گریباں اب تار تار رہتا ہے

سوجھتا نہیں کچھ بھی آج کل مجھے زینت
دور تک نگاہوں میں اک غبار رہتا ہے

تمہارا زخم اک تازہ نہیں ہے
تمہیں اس غم کا اندازہ نہیں ہے

مگر پھر بھی شعاعیں پھوٹتی ہیں
گلوں کے گال پر غازہ نہیں ہے

بلا کا حبس ہے کمرے کے اندر!
کوئی کھڑکی یا دروازہ نہیں ہے

مجھے برباد دنیا نے کیا ہے!
محبت کا یہ خمیازہ نہیں ہے

مری مٹھی میں ہے تقدیر زینتؔ
بکھر جائے وہ، شیرازہ نہیں ہے

Zeenat Dehelvi
F-2/308, Sundar Nagri,
Delhi-110093

غزلیں

دِوّیا جین

سنگ تیرے راہ یوں تو کوئی مشکل ہی نہیں
پورا کیسے ہو سفر تو اس میں شامل ہی نہیں

کوششیں ہونے لگیں بیکار اب تو سب میری
جستجو اس کی ہے جس کا کوئی حاصل ہی نہیں

سنگ تم بیٹھو جہاں بس ختم ہو جائے سفر
ورنہ میری رہ گزر کی کوئی منزل ہی نہیں

کیوں جلا کے رکھا ہے تم نے دریچے پہ چراغ
گزرے اُس کی شب جہاں یہ ویسی محفل ہی نہیں

تولتے ہو اپنی قسمت ڈھیر سے کیوں ریت کے
جس نے طوفاں کو تھا روکا یہ وہ ساحل ہی نہیں

کیا لکھیں گے ہم فسانہ اب دلِ برباد کا
غم پروئے لفظ کوئی اس کے قابل ہی نہیں

جو راہِ اُلفت دیکھا ہم نے ہم سفر کوئی نہیں
ہے ہم نواں کوئی نہیں اپنی گزر کوئی نہیں

خورشید کی ضد ہے ملے وہ آ کے اپنے چاند سے
اُس پے بھی بکھرے چاندنی ایسی سحر کوئی نہیں

اب ڈولتا ہے سایہ ایک میرے در و دیوار پہ
خوابوں کو جینے کی یوں بھی ہوتی پہر کوئی نہیں

ابنِ بطوطہ ہے یہ دل اس کا نہ کوئی ٹھور ہے
اس کی نہ منزل ہے کوئی نامِ سفر کوئی نہیں

چاہے وہ گر تو خاک کر دے چاہے تو نورِ سحر
مانند اس کے سمت یاں دوجی نظر کوئی نہیں

ہر باب کہتا ہے یہاں بس تیری میری داستاں
جو کر سکے سچ کو بیاں ایسا ہنر کوئی نہیں

Dr. Divya Jain
24D, Pocket-B
Sidhharth Extension
New Delhi-110014

لذیذ پکوان

چکن رول

چکن کا قیمہ دو سو پچاس گرام، تیل دو کھانے کے چمچ، پیاز ایک عدد (باریک کٹی ہوئی)، کالی مرچ ایک چائے کا چمچ، نمک ایک چائے کا چمچ، مسٹرڈ پاؤڈر ایک چائے کا چمچ، اوسٹر سوس ایک کھانے کا چمچ، سرکہ دو کھانے کے چمچ (چائے کا چمچ)، ادرک لہسن کا پیسٹ ایک کھانے کا چمچ، ہرا دھنیا دو کھانے کے چمچ (باریک کٹا ہوا)، ہری مرچ چار عدد (باریک کٹی ہوئی)، پودینہ کے پتے دو کھانے کے چمچ (باریک کٹے ہوئے)، پسا ہوا گرم مصالحہ آدھا چائے کا چمچ

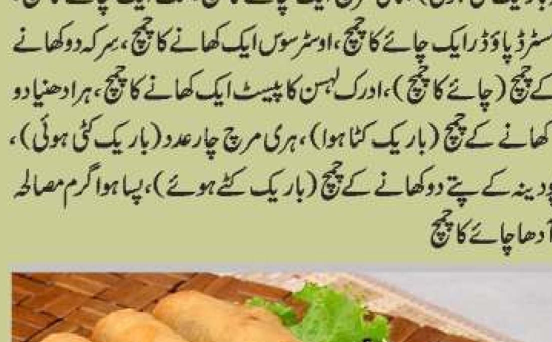

رول بنانے کے لیے:

میدہ ڈیڑھ کپ، نمک آدھا چائے کا چمچ، انڈے دو عدد، پانی ایک کپ

1. فلنگ کے لیے: ایک فرائنگ پین میں قیمہ پانی میں اُبال لیں۔
2. اب فرائنگ پین میں تیل ڈال کر اس میں پیاز کو ہلکا براؤن کر لیں۔
3. پھر اس میں ادرک لہسن کا پیسٹ اور چکن کا قیمہ شامل کر دیں۔
4. اب اس میں اوسٹر سوس، سرکہ، نمک، کالی مرچ، گرم مصالحہ اور مسٹرڈ پاؤڈر ڈال کر اچھی طرح سے بھون لیں۔
5. آخر میں ہرا دھنیا، ہری مرچیں اور پودینے کے پتے شامل کر لیں۔

رول بنانے کے لیے:

6. ایک برتن میں میدہ، انڈے، نمک اور پانی کو مکس کر لیں۔
7. اب اس مکسچر کو باریک چھنی سے چھان لیں۔
8. ایک فرائنگ پین میں تھوڑا سا تیل ڈال کر چکنا کر لیں۔
9. اب اس میں تھوڑا سا مکسچر ڈالیں اور گول ٹکی کی طرح پھیلا کر ایک سائیڈ سے پکا لیں۔
10. پھر اس کو تھوڑا سا ٹھنڈا کر کے نکال لیں۔
11. اب اس میں قیمے کا مکسچر بھر لیں اور رول بنا لیں۔
12. پھر ان کو ہلکی آنچ پر فرائی کر کے گولڈن براؤن کر لیں۔

فالودہ قلفی

دودھ 2 لیٹر، کھویا 250 گرام، چینی 1 کپ، پسی الائچی 1 چٹکی، عرق گلاب 1 چائے کا چمچ، پستہ (کرش) 4 کھانے کے چمچ، بادام (کرش) 4 کھانے کے چمچ، فالودہ (پانی 3 کپ)، چینی 1 کپ، کارن فلور 1 کپ، ریڈ سیرپ حسب ضرورت

1. دودھ کو اتنا پکائیں کہ وہ گاڑھا ہو جائے اور تھوڑا سا اس کا رنگ بدل جائے۔

2. اب اس میں چینی شامل کر کے اتنا پکائیں کہ چینی حل ہو جائے۔
3. اب اس میں کھویا، پسی الائچی، عرق گلاب، پستہ اور بادام ڈال کے آمیزہ ٹھنڈا کر لیں اور سانچوں میں بھر کے فریز کر لیں۔
4. (فالودہ) پانی میں کارن فلور مکس کر کے چینی مکس کریں اور پھر پین میں اسے ہلکی آنچ پر چمچ ہلاتے ہوئے پکائیں۔ یہ ٹرانسپرنٹ کلر کا گاڑھا سا آمیزہ بن جائے گا۔
5. اگر آپ چاہیں تو اس میں تھوڑا سا پیلا رنگ بھی ڈال سکتے ہیں۔
6. باؤل میں ٹھنڈا برف والا پانی لیں، کارن فلور والا آمیزہ مشین میں ڈال کے سویاں/ فالودہ بناتے ہوئے ٹھنڈے پانی میں ڈالتے جائیں۔
7. قلفی کے اوپر سویاں/ فالودہ اور ان پر ریڈ سیرپ ڈال کے سرو کریں۔

انڈے کا حلوہ

ڈبل روٹی (سلائس) چھ عدد، انڈے آٹھ عدد، چینی ایک کپ، دودھ ایک پاؤ، زعفران ایسنس چند قطرے، زعفران ایک چٹکی، بادام،

پستے حسب ضرورت، گھی ایک کپ

1. ڈبل روٹی کے کنارے کاٹیں اور بریڈ کے پیسز کر لیں۔
2. اب پین میں دودھ، چینی، انڈے اور بریڈ کو مکس کریں۔
3. پھر اسے ہلکی آنچ پر پکائیں۔
4. جب آمیزہ خشک ہونے لگے تو اس میں گھی اور زعفران ایسنس شامل کر کے بھونیں۔
5. حلوہ گھی چھوڑ دے تو اس میں زعفران ڈال کر مکس کر لیں۔
6. آخر میں ڈش آؤٹ کر کے بادام پستے سے گارنش کر کے سرو کریں۔

سوجی کی برفی

سوجی ایک کپ، پسی چینی ایک کپ، کھویا آدھا کپ، سبز الائچی پانچ عدد، ناریل آدھا کپ، پستے دس عدد، بادام دس عدد، ڈالڈا کوکنگ آئل دو کھانے کے چمچ

1. کڑاہی میں ڈالڈا کوکنگ آئل گرم کریں۔
2. پھر اس میں الائچی ڈال دیں جب خوشبو آنے لگے تو سوجی بھون لیں۔
3. پھر اُتار کر ٹھنڈا کر کے پسی چینی، ناریل اور کھویا اچھی طرح مکس کریں۔
4. ایک ٹرے میں ذرا سی چکنائی لگا کر حلوہ پھیلا دیں۔ چوکور یا تکونے ٹکڑے کاٹ لیں۔

پستے، بادام ڈال کر سجا دیں۔ چاہیں تو چاندی کے ورق بھی لگا دیں۔

(بحوالہ: www.khanapakana.com)

حسین فاروقی

نظام ہضم

غذا کا حصول ہماری زندگی کا بنیادی مقصد ہے۔ غذا کے بغیر نہ انسان زندہ رہ سکتا ہے نہ اس کی سوجھ بوجھ باقی رہ سکتی ہے۔ غذا انسانی زندگی اور اس کی صحت کی بقا کے لیے اس قدر ضروری ہوتے ہوئے بھی یہ بات عجیب لگتی ہے کہ ہم میں سے بہت سے افراد ایسے ہیں جو غذا کے جائز استعمال سے واقف نہیں ہیں، کون سی چیز کس وقت کھانی چاہیے اس کا علم ہمیں نہیں ہے۔ ان حالات کے تحت یہ ضروری ہے کہ پہلے یہ معلوم کیا جائے کہ کون سی غذا ہمارے جسم کے لیے مناسب ہے اور متوازن غذا کیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ علامتیں جن کا تعلق جسم میں غذا کی کمی سے ہوتا ہے ان کو بھی جانا جائے۔

جسم میں بھرپور غذائیت کی علامتیں	جسم میں ناکافی غذائیت کی علامتیں
(1) جسم کی ساخت، قد اور عمر کے تناسب سے بدن کا وزن معمول پر ہونا۔	جسم کی ساخت، قد اور عمر کے تناسب سے بدن کا وزن کم یا زائد ہونا۔ جسم کی نشوونما عمر کے حساب سے نہ ہونا۔ بدن کے وزن میں گاہے بہ گاہے ضرورت سے زیادہ کمی یا زیادتی ہونا۔
(2) تن کر کھڑے ہونے پر ہاتھ، پیر، بازو کا سیدھے ہونا، شکم اندر کی جانب چھاتی بھری ہوئی اور تھوڑی اندر ہونا۔	کھڑے ہونے پر سینہ نکلا ہوا، شانے ڈھیلے اور شکم ابھرا ہوا ہونا۔
(3) جلد نکھری ہوئی اور صحت مند ہونا۔ منہ کے اندر کی جلد کا سرخ ہونا۔	جلد کی رنگت پھیکی زردی مائل ہونا۔ منہ کے اندر کی جلد کا سرخ نہ ہونا۔
(4) دانت برابر جمے ہوئے اور جبڑے مضبوط ہونا۔	دانت کا برابر سے نہ ہونا۔ جبڑے کمزور ہونا۔
(5) بال نرم اور چمکدار ہونا۔	بال خشک اور اس کی رنگت کا اڑا ہونا۔
(6) صاف چمکدار آنکھیں۔	آنکھوں میں چمک نہ ہونا، آنکھوں پر روشنی پڑنے پر تکلیف ہونا۔
آنکھوں پر روشنی پڑنے پر تکلیف نہ ہونا۔	آنکھوں کے سامنے دھبے نظر آنا، دھندلا دکھائی دینا۔ آنکھوں میں سوزش ہونا۔
(7) بھوک کا پوری طرح لگنا۔ ہضم کا انتظام درست ہونا	بھوک کم لگنا، ہضم کا عمل درست نہ ہونا۔
(8) بیماری سے مدافعت کی صلاحیت جسم میں موجود ہونا۔	بدن کا بیماری کے چھوت کو جلدی سے قبول کرنا۔ بیماری سے صحت مند ہونے کے لیے زیادہ وقت درکار ہونا۔
(9) محنت مشقت سے دل نہ چرانا۔ توانائی کا احساس اجاگر ہونا۔	محنت مشقت کے کاموں میں دل نہ لگنا۔ تھکن کا احساس اجاگر ہونا۔

(10) زندگی سے دلچسپی ہونا۔ زندگی سے بیزاری کا رویہ ہونا۔

ہمارا جسم جو کہ مشین کے مثل ہے وہ مشین کی ہی طرح ہر وقت سرگرم عمل رہتا ہے۔ آدمی سو رہا یا جاگ رہا عمل تنفس، خون کا دوران برقرار رہتا ہے۔ مشین کی طرح جسم کو توانائی کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور جس طرح مشین کے پرزے کام کرتے کرتے تھک جاتے ہیں اسی طرح جسم کے خلیوں (Cells) کی ٹوٹ پھوٹ ہوتی ہے۔ خلیوں کی مرمت اور جسم کی توانائی (قوت) کو معمول پر رکھنے کے لیے متوازن غذا کی ضرورت ہوتی ہے۔ شاستروں، ہندوستان کی قدیم کتابوں میں مناسب متوازن غذا کی تعریف کچھ اس طرح کی گئی ہے۔

''مناسب اور بہتر غذا وہ ہوتی ہے جس سے جسم کو غذائیت، توانائی فراہم ہو سکے اور آدمی کو سیری حاصل ہو، سکون نصیب ہو، خون میں اضافہ ہو، یادداشت بہتر ہو سکے، آدمی کی صحت کا معیار بلند ہو اور عمر طویل ہو۔''

غذا عموماً ٹھوس مادوں پر مبنی ہوتی ہے اور آنتوں میں غذا کا جذب ہونا اسی وقت ممکن ہوتا ہے جب کہ انہضام نلی میں غذا کیمیاوی اور طبعیاتی رد عمل کے ذریعہ رقیق صورت اختیار کر لیتی ہے اور بچے کھچے مادے فضلہ کی شکل اختیار کر تے ہیں۔ انہضام نلی سے وابستہ غدود بھی ہوتے ہیں جو کہ ہضم کے عمل کے لیے ضروری رس، خامرات (Enzyme) پیدا کرتے ہیں۔ انہضام نلی میں منہ کا خلا (Oral Cavity)، فم حلق (Phalanx)، مری (Oesophagus)، معدہ (Stomach)، چھوٹی آنت (Small intestine)، بڑی آنت ((Large Intestine، امعائے مستقیم (Rectum) آتے ہیں۔ نظام ہضم پر اعصاب قدرت رکھتے ہیں۔

غذا کے منہ میں ہضم ہونے کا عمل

غذا جب منہ میں لی جاتی ہے تو دانت اسے چبا کر چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کر دیتے ہیں۔ منہ میں چیزوں کے کاٹنے توڑنے اور پیسنے کے لیے الگ الگ قسم کے دانت ہوتے ہیں۔ غذا کو کاٹنے والے دانت تعداد میں آٹھ ہوتے ہیں جب کہ چیزوں کو توڑنے والے دانت چار اور غذا کو پیسنے والے دانت بیس ہوتے ہیں۔ دانت اندر سے نرم ہوتے ہیں اور اوپری حصہ دانتوں کا سخت ہوتا ہے۔ دانتوں پر اینمیل کی پاش بھی ہوتی ہے۔ یہ اینمیل دانتوں کا سب سے سخت حصہ ہوتا ہے اور اس کے اتر جانے پر دانت کمزور ہو جاتے ہیں۔ ٹھنڈا پانی گرم چیزیں لگنے لگتی ہیں۔

غذا جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے۔ دانتوں کے ذریعے کاٹ پیس کر چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کر دی جاتی ہے۔ داڑھ کی اس کوشش میں زبان بھی غذا کو الٹ پلٹ کر پیسنے میں مدد دیتی ہے۔ غذا جب دانتوں کے ذریعہ چبائی جاتی ہے تو اسی وقت پانی کے مثل تھوک اس میں شامل ہو جاتا ہے۔ یہ تھوک تین جوڑ غدود کے ذریعہ منہ میں آتا ہے اور اس میں ہاضم رس (خامرات) ہوتے ہیں۔ ہاضم رس میں معدنیاتی نمک، عام نمک، بائی کاربونیٹ، پانی اور ٹایالین (Ptyaline) اور میوسین ہوتے ہیں۔ Ptyaline غذا میں موجود اسٹارچ کو سالٹوز (Paltose) میں بدل دیتا ہے، اب غذا زبان کی مدد سے فم حلق میں داخل ہوتی ہے اور مری میں پہنچتی ہے۔ مری کی لمبائی پچیس سینٹی میٹر ہوتی ہے اور اس کی دیوار میں ہونے والے انقباضی عمل یعنی سکڑنے پھیلنے کی وجہ سے غذا رفتہ رفتہ کر کے معدہ میں پہنچتی ہے۔ معدہ شکم میں اوپر کی سمت ہوتا ہے اور جگر کے بائیں حصہ سے قدرے چھپا رہتا ہے۔ معدہ جب خالی رہتا ہے تو اس کی دیوار کی اندرونی سطح چنٹ کے مثل ہوتی ہے لیکن معدہ میں جب غذا وافر مقدار میں ہوتی ہے تو معدہ کے پھیلنے سے چنٹ ختم ہو جاتی ہے۔ معدہ کی دیوار میں ہاضم رس پیدا کرنے والے غدود اور ہائیڈرو کلورک تیزاب اور میوسین خارج کرنے والے خلیہ ہوتے ہیں۔ معدہ کی دیوار کی حرکت سے دانتوں سے پسی ہوئی غذا

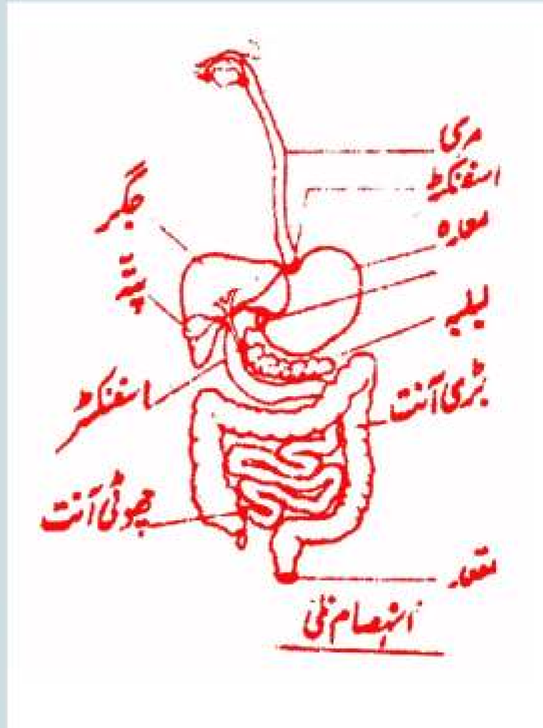

الگدی کی شکل اختیار کرلیتی اور غذا معدے کے رس کے عمل کے باعث ہضم ہونا شروع ہوتی ہے۔ معدہ کے رس میں 99% فیصد پانی، اعشاریہ دو فی صد ہائیڈر وکلورک تیزاب اور خامرات (Enzyme) پیپسن (Pepsin)، رینن (Renin) لائپیز (Lipase) ہوتے ہیں۔ ہائیڈرو کلورک تیزاب سے غذا میں موجود بیکٹر یا ختم ہو جاتے ہیں اور رینن (Renin) دودھ کو پھاڑ دیتا ہے۔ پھٹے دودھ میں موجود کیسین (Casein) پر ہاضم رس اب مزید عمل کرتے ہیں اور پروٹین کو پیپٹون (Peptone) میں تبدیل کرکے اس قابل بنادیتے ہیں کہ وہ ہضم ہوسکے اس کے علاوہ معدہ کے رس میں موجود لائپیز (Lipase) چربی پر عمل کرکے اسے ہضم کے قابل بنادیتے ہیں۔ یہ نیم ہضم شدہ غذا قدرے معدے کی دیوار سے جذب کی جاتی ہے اور آہستہ آہستہ آنت کی سمت بڑھتی ہے چھوٹی آنت کی لمبائی 675 سینٹی میٹر ہوتی ہے اور اسے تین حصوں میں بخوبی تقسیم کیا جا سکتا ہے ڈیو ڈینم (Duodenum)، جیجی نم (Jejunum)، ایلیم (Ilium)۔ ڈیوڈینم میں جگر اور لبلبہ سے پیدا ہونے والا ہاضم میں قنال کے ذریعہ غذا میں آن ملتا ہے۔ معدہ سے آنت میں آئی ہوئی غذا چونکہ تیزابیت رکھتی ہے اس لیے جگر اور لبلبہ کے رس اس تیزابیت کو ختم کر دیتے ہیں اور غذا اس قابل بن جاتی ہے کہ اس پر آنتوں کے ہاضم رس عمل کرسکیں۔ لبلبہ کے رس میں پایا جانے والا لائپیز Lipase چربی کو گلسرال میں بدل دیتا ہے، امالیز (lamulase) اسٹارچ کو مالٹوز میں اور ٹرپسین (Tripsin) پروٹین کو مائی نوایسڈ میں، اس کے علاوہ آنتوں کی دیواروں سے پیدا ہونے والا رس ارسپن (Erespin) باقی ماندہ پروٹین کو امائی نوایسڈ میں تبدیل کر دیتا ہے اور سکریز (Sucrase) سکروز شکر کو گلوکوز میں بدل دیتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ مالٹیز (Maltase) اور لیکٹیز (Lactase) مالٹوز اور لیکٹوز شکر کو گلوکوز میں بدل دیتے ہیں۔ اب ہضم شدہ غذا آنتوں کی دیواروں سے اندر کی جانب انگلی کے مثل نکلے ہوئے ابھاروں کے ذریعہ جذب کی جاتی ہے اور گلوکوز اور امائی نو ایسڈ شریانوں میں خون کی نالیوں کے ذریعہ جذب کر لی جاتی ہیں جب کہ ہضم شدہ چربی آنتوں میں موجود ابھار کی لفاوی نالیوں میں داخل ہو جاتی ہے۔ یہ غذائی مادوں سے پر خون جگر میں جب پہنچتا ہے تو جسم کی ضرورت کے مطابق گلوکوز اور امائی نوایسڈ خون کے ذریعہ اعضا کو فراہم کر دیے جاتے ہیں اور باقی ماندہ گلوکوز جگر میں گلائی کوجن میں تبدیل ہوکر یکجا ہو جاتا ہے۔ جگر کی یہ صلاحیت محدود ہوتی ہے اور وہ افراد جو کہ اسٹارچ کا استعمال زیادہ کرتے ہیں ان میں گلوکوز چربی میں تبدیل ہوکر جسم میں مختلف مقامات پر یکجا ہوتی ہے، آدمی موٹا ہو جاتا ہے۔ غذا چھوٹی آنت میں ہضم ہونے اور اس سے ضروری مادے جذب کرنے کے بعد بڑی آنت میں پہنچتی ہے۔ بڑی آنت چھوٹی آنت کے مقابلے میں لمبائی میں کم ہوتی ہے لیکن اس کی چوڑائی نسبتاً زیادہ ہوتی ہے۔ بڑی آنت کو سہولت کی غرض سے تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ جیسے سیکم قولون (Colon) اور امعائے مستقیم (Rectum) سیکم سے متعلق کانی آنت بھی ہوتی ہے۔ کانی آنت آدمی میں مختصر نو دس سینٹی میٹر لمبی ہوتی ہے۔ اس کے برعکس سبزی پر گزر کرنے والے جانوروں میں یہ کافی لمبی ہوتی ہے۔

غذا جیسا کہ اوپر بتایا جاچکا ہے آنتوں کے ذریعہ ہضم کی جاتی ہے اور اس سے ضروری مادے جذب کرنے کے بعد یہ جب بڑی آنت میں پہنچتی ہے تو اس میں سے پانی کی کثیر مقدار اور نمکیات جذب کر لیے جاتے ہیں اور جو مادہ باقی بچا رہتا ہے وہ فضلہ کہلاتا ہے یہ فضلہ امعائے مستقیم میں اکٹھا ہوتا رہتا ہے اور وقتاً فوقتاً مقعد کی راہ باہر نکال دیا جاتا ہے۔

(تیمارداری، حسین فاروقی، تیسرا ایڈیشن 1990، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی)

□□□

عرقِ گلاب کی جادوئی خصوصیات

گلاب کو پھولوں کا بادشاہ سمجھا جاتا ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ اس کا استعمال جراثیم سے پاک کرنے اور ڈپریشن سے نجات کے لیے بھی ہوتا ہے۔

اس پھول سے نکلنے والا عرق گلاب جلد کو صحتمند اور دلکش بنانے کا ایک سستا ترین طریقہ بھی ہے۔ عرق گلاب کا استعمال صدیوں سے چلا آرہا ہے اور آج بھی کئی کاسمیٹک مصنوعات میں اس کا استعمال کیا جاتا ہے۔

چونکہ اس میں اینٹی سیپٹک (انفیکشن سے بچانے والا)، اینٹی بیکٹیریئل (بیکٹیریا سے بچانے والا) اور اینٹی آکسیڈنٹ کی خصوصیات ہیں لہٰذا یہ ہر اقسام کی جلد کے لیے کارآمد ہے۔

یہ ہمارے جسم میں نمی کی مناسب مقدار برقرار رکھنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے جس سے جلد نرم اور چمکدار رہتی ہے۔ یہ ہماری جلد کی خشکی ختم کردیتا ہے اور تمام موسموں کے لیے ایک قدرتی موئسچرائیزر ہے۔

جلد کو نرم و ملائم رکھتا ہے

عرق گلاب کا استعمال ایک قدرتی اور سستے کلینزر کے طور پر ہوتا ہے۔ روئی کو عرق گلاب میں ڈبوئیے اور اپنی جلد پر جمی گرد کو صاف کرنے کے لیے نفاست سے ملیے۔ بہتر ہے کہ یہ عمل رات کے اوقات میں کیا جائے۔ اس طرح چہرے پر موجود دن بھر کے جمع میل کے نشان صاف ہو جائیں گے۔

حساس جلد کا خیال کرنا بہت مشکل ہوتا ہے اور کبھی کبھار ان پر کوئی بھی اسکن کیئر مصنوعات کارآمد ثابت نہیں ہوتیں۔ ایسی صورتحال میں عرق گلاب ایک بہتر ٹونر کا کام دیتا ہے۔ صرف جلد پر روئی کی مدد سے عرق گلاب لگائیں، اس طرح یہ جلد کی خراش کی کوفت کو کم کردے گا۔

دو چمچ صندل کا پاؤڈر اور ایک چمچ عرق گلاب کو ملا کر ایک گاڑھا پیسٹ بنا کر اپنے چہرے پر لگادیں اور خشک ہونے کے بعد اپنا چہرہ دھو لیں۔ دونوں کا امتزاج جلد کو کافی نرم اور چمکدار کردیتا ہے۔

عرق گلاب کسی ٹانک سے کم نہیں۔ آپ کسی بھی موسم میں باہر جائیں، یا طویل سفر کے بعد گھر واپس آئیں اور اپنے چہرے کو تروتازہ کرنا چاہیں تو اپنے چہرے پر عرق گلاب کے چند قطرے چھڑک دیں۔ اس طرح آپ کی جلد نمی اور قدرتی چمک کے ساتھ تروتازہ ہوجائے گی۔

فیس ماسکس آپ کی جلد کی رونق پر نمایاں اثر کرتے ہیں۔ ایک چمچ ملتانی مٹی، دو چمچ عرق گلاب اور لیموں کے رس کے چند قطرے آپس میں ملالیں۔ اس فیس ماسک کو اپنے چہرے اور گلے پر 15 منٹ کے لیے لگائیں اور پھر عام پانی سے صاف کرلیں۔

چہرے سے چھائیاں ختم کرتا ہے

اگر آپ اپنے چہرے سے چھائیاں ختم کرنا چاہتے ہیں تو عرق گلاب اس کا بہترین علاج ہے۔ دو چمچ بیسن، ایک چٹکی ہلدی اور عرق گلاب کو ملا کر ایک نرم پیسٹ بنالیں۔ پیسٹ کو اپنے چہرے پر لگائیں اور خشک ہونے کے بعد چہرے کو پانی سے دھولیں۔ کوئی بھی چیز آپ کے چہرے کو اس سے زیادہ تروتازہ نہیں بنا سکتی۔

جہاں تک دانوں اور مہاسوں کے علاج کا تعلق ہے تو عرق گلاب لگانے سے یہ بیکٹیریا کی افزائش کم کردیتا ہے؛ جلد کو نمی فراہم کرتا ہے اور مہاسوں کا خاتمہ کردیتا ہے۔

عرق گلاب اور چقندر کا رس ملا کر اپنے ہونٹوں پر روزانہ دن میں دو سے چار بار لگائیں۔ یہ موئسچرائیزر ہونٹوں کو گلابی بنانے اور سیاہ ہونے سے بچانے کا ایک بہترین طریقہ ہے۔

ہاتھوں کی خشکی دور کرتا ہے

سرف اور بلیچ سے برتن اور کپڑے دھونے سے آپ کے ہاتھ خشکی کا شکار ہو سکتے ہیں۔ کیا آپ ان گھریلو کاموں کے بعد اپنے ہاتھوں کو نرم و ملائم بنانا چاہتے ہیں؟ تو اپنے ہاتھوں کو نرم ملائم بنانے کے لیے ایک لوشن بنائیں۔

لوشن بنانے کے لیے چار چمچ گلیسرین، چار چمچ لیموں کا رس اور آٹھ چمچ عرق گلاب کو آپس میں ملا دیں۔ مکسچر کو بوتل میں بھر کر رکھ دیں اور

کپڑے اور برتن دھونے کے بعد اپنے ہاتھوں پر لگالیں۔

نیل پالش کا مسلسل استعمال ناخن کے رنگ کو خراب کر دیتا ہے۔ اپنے ناخنوں کی قدرتی چمک واپس لانے کے لیے عرق گلاب اور لیموں کے رس کو برابر مقدار میں ملا کر ناخنوں پر لگائیں۔

آنکھوں کی سوجن ٹھیک کرتا ہے

عرق گلاب آنکھوں کی سوجن ٹھیک کرنے کے لیے بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔ روئی کو عرق گلاب میں بھگو کر تھکاوٹ سے چور آنکھوں پر لگائیں۔ اس طرح آپ کو فوری آرام مل جائے گا۔

عرق گلاب سے صرف جلد کی حفاظت کے فوائد ہی حاصل نہیں ہوتے، بلکہ ٹوٹتے بالوں کا علاج کرنے میں بھی مدد ملتی ہے کیونکہ یہ بالوں کا پی ایچ متوازن کرتا ہے۔

عرق گلاب کا ایک اور زبردست فائدہ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقوں کو ختم کرنا ہے۔ صرف ایک چمچ کھیرے کے جوس میں عرق گلاب ملائیں اور اس کے بعد روئی کو آمیزے میں بھگو کر سیاہ حلقوں پر نفاست سے لگائیں۔

بالوں کو مضبوطی دیتا ہے

اگر آپ کے بال بال سیدھے کرنے والی استری کے کثرت استعمال سے کمزور ہو چکے ہیں تو یہ اس کا بہترین علاج ہے۔ ایک پیالے میں ایک کپ عرق گلاب، دو وٹامن ای کیپسول اور زیتون کے تیل کا آدھا چمچ ڈال کر آپس میں ملا لیں۔ یہ آمیزہ ایک اسپرے بوتل میں انڈیل دیں اور گیلے بالوں پر اسپرے کریں۔

بالوں کے لیے عرق گلاب کے استعمال کا سب سے آسان طریقہ عرق گلاب سے دھونا ہے۔ اپنے بالوں کو حسب معمول شیمپو کریں پھر ایک کپ عرق گلاب سے اپنے بالوں کو دھولیں۔ اس طرح آپ کے بالوں میں نمی، دیرینہ خوشبو اور چمک پیدا ہوگی۔

تھریڈنگ

خواتین اپنے چہرے سے غیر ضروری بالوں کو صاف کرنے کے لیے تھریڈنگ کرتی ہیں۔ تھریڈنگ سے پہلے فاؤنڈیشن اور پاؤڈر کی غیر ضروری تہہ بالوں کو تھریڈ کرنے کی راہ میں حائل ہوتی ہے اس لیے پہلے چہرے کو میک اپ سے پاک کریں اور چہرے پر یا جس جگہ تھریڈنگ کرنا ہے وہاں لوز پاؤڈر لگائیں اس سے بال واضح نظر آتے ہیں اور تھریڈنگ کرنے میں کافی سہولت ہوجاتی ہے اس کے علاوہ پاؤڈر کی وجہ سے جلد بھی نرم رہتی ہے۔ جلد چونکہ نازک ہوتی ہے اس لیے بالوں کو تھریڈ کرنے سے متاثرہ جگہ سرخ ہوتی ہے اور بعض اوقات پھول بھی جاتی ہے۔ سرخی کو ختم کرنے کے لیے برف کا استعمال یا پھر کیلا میں لوشن کا استعمال بھی مفید رہتا ہے اور تھریڈنگ کے بعد دو گھنٹے تک میک اپ استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ تھریڈنگ کرنے سے مسام کھلے ہوتے ہیں اور میک اپ کا استعمال جلد کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔

(بحوالہ: www.roopsuraksha.com)

تاثرات: نگر نگر سے

بلاشبہ 'خواتین دنیا' خواتین کے لیے تحریری صورت میں اپنی شناخت منوانے کا ایک اہم پلیٹ فارم ہے۔ ایک ایسا پلیٹ فارم جہاں صرف سینئر قلم کار ہی نہیں بلکہ مجھ جیسی طفل مکتب کو بھی نمایاں جگہ دے کر حوصلہ بخشا جارہا ہے۔ مارچ کے شمارے میں 'شخصیت' کے عنوان سے ڈاکٹر آمنہ تحسین کا مضمون 'باجی جمال النساء: حیدرآباد کی ایک اولوالعزم خاتون' قابل ذکر ہے۔ اس مضمون میں ڈاکٹر آمنہ نے جمال النساء کی شخصیت اور ان کے عزم و ارادے کو جس طرح تحریری جامہ پہنایا ہے، وہ لائق تعریف ہے۔ بلاشبہ جمال النساء جیسی خاتون مسلم معاشرے میں خال خال ہی ملتی ہیں۔ اس مضمون کو پڑھنے کے بعد اندازہ ہوا کہ اگر کسی کا عزم پکا اور ارادے نیک ہوں تو وہ اپنی منزل تک ضرور پہنچتا ہے۔

نسرین بیگم (علیگ) کی تحریر 'عورتوں کے مسائل اور ہمارا معاشرہ' بہت متاثر کرتی ہے۔ اس مضمون میں عورتوں کے مسائل کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔ عصر حاضر میں عورتوں کے کئی مسائل ہیں، جن میں سب سے اہم مسئلہ ان کی تعلیم ہے۔ ان دنوں ہمارا معاشرہ بدل رہا ہے۔ لڑکوں کے ساتھ لڑکیوں کو بھی تعلیم حاصل کرنے کی پوری آزادی دی جارہی ہے اور عملی زندگی میں تو لڑکیاں، لڑکوں سے کہیں آگے نکلتی دکھائی دے رہی ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہمارے معاشرے اور سماج میں اب بھی ایسی ذہنیت کے لوگ موجود ہیں جو باصلاحیت اور باہنر لڑکیوں/عورتوں کو اپنے نصب العین کو پورا کرنے پر قدغن لگاتے ہیں۔ مضمون نگار نے بہت محنت سے عورتوں کے مسائل اور معاشرے کی تصویر ہمارے سامنے پیش کی ہے۔ اس کے لیے وہ مبارکباد کی مستحق ہیں۔

'جہان نسواں' کے کالم میں 'مادری زبان کی اہمیت اور والدین کی ذمہ داریاں' (گلشن آرا) بہت اہم تحریر ہے۔ ان دنوں سوشل میڈیا کا زمانہ ہے۔ اسمارٹ فون اور انٹرنیٹ کی سہولت نے نوجوانوں اور بچوں کو تیز سے تیز تر بنا دیا ہے۔ انگریزی میڈیم میں بچوں کو تعلیم دلانے کا چلن عام ہے۔ ایسے میں ہمارے بچے اپنی مادری زبان سے دور بہت دور ہوتے جا رہے ہیں۔ اس کے ذمہ دار بہت حد تک والدین بھی ہیں۔ میں اگر اپنی بات کروں تو میں نے اپنی پرائمری سطح سے لے کر یونیورسٹی تک کی تعلیم ہندی میں حاصل کی اور ہندی زبان ہی میری روزی روٹی کا ذریعہ بنی لیکن مجھے فخر ہے کہ میری مادری زبان اردو ہے۔ میرے والدین نے مجھے بچپن میں مکتب میں بھیجا، جہاں سے میں نے عربی اور اردو زبان سیکھی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ والدین اپنے بچوں کو خواہ کسی بھی میڈیم سے تعلیم دلوائیں لیکن انھیں اپنے بچوں کو یہ بتانا ہوگا کہ ان کی مادری زبان کیا ہے اور اس کی کیا اہمیت ہے۔ محترمہ گلشن آرا نے

اپنے مضمون میں انہی نکات کی طرف خصوصی توجہ دلائی ہے۔

افسانے کے کالم میں 'گھر کا چراغ' (خلیق النساء) اور 'اپنا عکس' (ترنم جمال)، 'حسن سخن' میں شیخ صابرالدین نور کی نظم بہت خوب ہے۔

رسالہ اگر خواتین سے متعلق ہو اور اس میں 'باورچی خانہ' اور 'آرائش و زیبائش' سے متعلق کچھ نہ ہو تو ادھورا ادھورا سا لگتا ہے۔ مقام شکر ہے کہ ایڈیٹر محترم نے اس کا بھی خیال رکھا ہے۔ اس کالم میں ارم نعیم کے 'لذیذ پکوان' کی ریسیپی اپنے گھر میں نئی ڈشیز کی تیاری کے لیے بیحد معاون ہے جبکہ 'حسن کی نگہداشت' کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

'صحت' کے کالم میں ڈاکٹر احسان رؤف کا مضمون 'سروائیکل کینسر: رحم کا ایک اہم کینسر' بہت معلوماتی ہے۔ یہ بیماری ان دنوں عام ہوتی جارہی ہے۔ اللہ سبھوں کو اس بیماری سے محفوظ رکھے۔ ڈاکٹر موصوف نے اپنی تحریر میں اس بیماری سے متعلق کئی اہم باتوں کی طرف ہماری توجہ دلائی ہے اور اس سے بچنے کی تدابیر بھی بتائی ہیں۔

مجموعی طور پر ماہنامہ 'خواتین دنیا' کا مارچ 2019 کا شمارہ اپنے سابقہ شماروں کی طرح لاجواب ہے۔ خواتین سے متعلق اہم اور سلگتے ہوئے موضوعات کو رسالے میں نمایاں جگہ دی گئی ہے۔

محمودہ خانم، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ ہندی، خضرپور کالج، کولکاتا

"ماہنامہ خواتین دنیا" مارچ 2019 کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ اسی ماہ کی آٹھ تاریخ کو بین الاقوامی یوم خواتین کے طور پر منایا جاتا ہے۔ اس لیے مارچ کا شمارہ 'عالمی یوم خواتین" کے نام سے منسوب ہے۔ ویسے تو "ماہنامہ خواتین کی دنیا" خواتین کے نام اور ان کے موضوعات کے لیے وقف ہے۔ اس خاص شمارے میں مدیر نے کوشش کی ہے کہ اس میں زیادہ سے زیادہ نگارشات خواتین ہی کی ہوں۔ ساتھ ہی اس پر بھی انھوں نے بہت زور دیا ہے کہ موضوعات اور مسائل بھی خواتین کے متعلق ہوں۔ البتہ اس شمارے میں کچھ مرد حضرات کی بھی شمولیت ہے، لیکن ان کی نگارشات کے موضوعات خواتین کے متعلق ہی ہیں۔

اس شمارے میں شخصی، تحقیقی اور تنقیدی مضامین کے ساتھ ساتھ افسانے اور شاعری بھی شامل ہیں۔ اس کے علاوہ خواتین کا پسندیدہ موضوع 'پکوان' اور صحت سے متعلق مضمون بھی موجود ہے۔ اس شمارے کا پہلا مضمون ڈاکٹر آمنہ تحسین کا ہے، جس کا عنوان "باجی جمال النساء: حیدرآباد کی ایک اولوالعزم خاتون" ہے۔ ڈاکٹر آمنہ تحسین ایک ذہین اسکالر ہیں۔ ان کی زیادہ تر تخلیقات کا موضوع خواتین کے متعلق ہی ہوتا ہے۔ اس میں بھی انھوں نے جمال النساء کی ادبی خدمات پر ایک بھرپور تحقیق اور معلوماتی مضمون قلم بند کیا ہے۔ شیخ شوکت ندوی کا مضمون "پریم لتا اگروال: ماؤنٹ ایوریسٹ پر پہنچنے والی ہندوستانی خاتون" بھی قابل ذکر ہے۔ اس میں نسرین بیگم (علیگ) کا مضمون "عورتوں کے مسائل اور ہمارا معاشرہ" بھی لائق مطالعہ ہے۔ مضمون میں انھوں نے معاشرے میں پیش آنے والے خواتین کے مسائل پر بہترین گفتگو کی ہے۔ ان کے اس مضمون کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ انھوں نے اس مضمون میں بہت صاف اور سلیس زبان استعمال کی ہے۔ اسی طرح ناز آفرین کا مضمون "عالمی مسائل نسواں: ایک تجزیہ" گلشن آرا کا مضمون "مادری زبان کی اہمیت اور والدین کی ذمے داریاں" اور خاکسار کا مضمون "عصر حاضر کے اردو افسانوں میں نسائی مسائل کی عکاسی" خواتین کے مختلف مسائل و موضوعات کو بیان کرتے ہیں۔

اس شمارے میں محولہ بالا مضامین کے علاوہ افسانے بھی شامل ہیں۔ ان تمام افسانوں میں خواتین کے مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ایک مضمون بعنوان "لذیذ پکوان" شامل ہے، جس میں نئی نئی ڈش تیار کرنے کا طریقہ بتایا گیا ہے۔ صحت اور حسن کی نگہداشت کے عنوان سے بھی بہترین معلومات یکجا کی گئی ہے۔

یوں تو بہت سے رسائل میں خواتین کے مسائل پر مضمون دیکھنے کو ملتے ہیں لیکن "ماہنامہ خواتین کی دنیا" میں شامل خواتین کے موضوعات بالکل نئے اور انوکھے ہیں۔ بالخصوص اس شمارے میں تمام مضامین اور افسانے خواتین کے تعلق سے ہیں اور سب ایک دوسرے سے علاحدہ رنگ لیے ہوئے ہیں جو خواتین دنیا کے مختلف مسائل اور موضوعات کو پیش کرتے ہیں۔

محمد نہال افروز، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

ماہ فروری کا 'خواتین دنیا' جگمگاتا ہوا دل و دماغ میں روشنی بھر گیا۔ رسالے کو دیکھ کر میری خوشی کی انتہا نہ رہی کیونکہ اس شمارے میں میری کہانی "ہم تیری منزل نہ تھے" شائع ہوئی۔ آپ کی محنت اور کوششوں کا نتیجہ ہی ہے کہ اس کی مقبولیت میں دن بہ دن اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اردو ادب کی بقاء کے لیے آپ جو کارنامے انجام دے رہے ہیں وہ قابل تحسین و قابل فخر ہیں۔ میں اللہ رب العزت سے دعا کرتی ہوں کہ 'خواتین دنیا' کی دلکش و رنگینی ہمیشہ قائم و دائم رہے اور یہ رسالہ قارئین کے دلوں پر ہمیشہ اپنی ان مٹ چھاپ چھوڑتا رہے۔

روبینہ ساگر روبی، اچلپور سٹی، ضلع امراؤتی، مہاراشٹر

خواتین خبر نامہ

ڈاکٹر احمدی بیگم "ممتاز پروفیسر" ایوارڈ سے سرفراز

حیدر آباد۔24 اپریل (اخبار مشرق، دہلی) زندگی میں کچھ کرنے کچھ پانے کی تمنا ہو اور ساتھ ہی عزائم و حوصلے بلند ہوں تو انسان کو کامیابی ضرور ملتی ہے اور وہ اپنی منزل مقصود کو پالیتا ہے۔ حصول علم بلکہ زندگی کے مقصد کو پانے کے لیے بہت محنت و جستجو کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس نے محنت

کرلی اور حصول علم کا شوق اس کے ذہن پر ایک جنون کی طرح سوار ہوجائے تو اسے چھوٹے اسکولوں میں تعلیم حاصل کرنے کے باوجود ایک دن ہندوستان کی مشہور و معروف یونیورسٹیز میں ایک اہم مقام حاصل ہوجاتا ہے۔ ایسا ہی کچھ حیدر آباد سے تعلق رکھنے والی ڈاکٹر احمدی بیگم دختر بشیر الدین صدیقی کے ساتھ ہوا۔ عنبر پیٹ حیدر آباد کے ساکن سابق گزیٹیڈ آفیسر شعبہ مالیات، سکریٹریٹ بشیر باغ حیدر آباد کی دختر ڈاکٹر احمدی بیگم کا تقرر بطور اسسٹنٹ پروفیسر، (صدر شعبہ علم سماجیات) اسکول آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی، جین یونیورسٹی، بنگلور میں ہوا۔ ان کی پرائمری اور جونیئر کالج تک کی تعلیم مقامی اسکول میں ہوئی۔ اس کے بعد انھوں نے عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد سے ایم اے (سماجیات، تاریخ، انگریزی)، ایم فل (انگریزی)، ایم بی اے، بی ایڈ اور پی ایچ ڈی (سماجیات) میں ڈگریاں مکمل کی۔ ڈاکٹر احمدی پچھلے 13 سالوں سے درس و تدریس کے پیشہ سے وابستہ ہیں اور ملک اور بیرونی ملک میں تدریس کرنے کا خاصہ تجربہ رکھتی ہیں اور ہمہ وقت تحقیقی کاموں میں مصروف رہتی ہیں۔ خاص طور پر خواتین کے مسائل اور آئی ٹی انڈسٹری سے متعلق مسائل پر تحقیقی کاموں میں مشغول ہیں۔

لڑکیوں کو اعلیٰ تعلیم اور اسلامی معاشرت سے آراستہ ہونا ضروری

این ٹی آر ڈگری کالج محبوب نگر میں آگرہ سے سعدیہ سلیم کا آن لائن لیکچر

(محبوب نگر 15 اپریل) علم روشنی ہے جس سے جہالت کے اندھیرے دور ہوتے ہیں۔ تعلیم حاصل کرنے کا مطلب صرف اسکول، کالج یونیورسٹی سے ڈگری لینا نہیں بلکہ اس کے ساتھ تمیز اور تہذیب سیکھنا بھی شامل ہے تاکہ ایک پڑھا لکھا انسان اپنی معاشرتی روایات کا خیال رکھ سکے۔

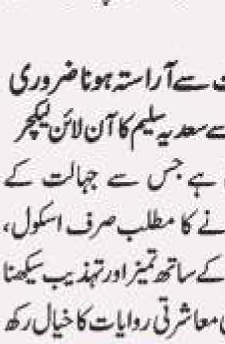

موجودہ زمانے میں لڑکوں کے مقابلے میں لڑکیاں تعلیم کے میدان میں پیش پیش ہیں۔ لیکن ان کی راہ میں کچھ سماجی رکاوٹیں ہیں جن کو دور کرتے ہوئے عصر حاضر میں لڑکیاں اعلیٰ تعلیم حاصل کرسکتی ہیں اور اسلامی شعائر کی پابندی کے

ساتھ اعلیٰ تعلیم کے زیور سے آراستہ ہوتے ہوئے ملک و قوم کا نام روشن کرسکتی ہیں۔ ان خیالات کا اظہار محترمہ سعدیہ سلیم صاحبہ لیکچرر اردو سینٹ جارج کالج آگرہ و پی ایچ ڈی اسکالر عثمانیہ یونیورسٹی نے این ٹی آر کالج محبوب نگر کی طالبات سے خطاب کرتے ہوئے اپنے آن لائن لیکچر میں کیا۔ ڈاکٹر محمد اسلم فاروقی صدر شعبہ اردو این ٹی آر کالج نے اس لیکچر کا اہتمام کیا اور ذریعے فون بلیو ٹوتھ اسپیکر سے رابطہ کرتے ہوئے آگرہ سے سعدیہ سلیم صاحبہ کی براہ راست گفتگو کو یقینی بنایا۔ محترمہ سعدیہ سلیم نے اپنا تعارف پیش کرتے ہوئے کہا کہ وہ خود امور خانہ داری نبھاتے ہوئے عثمانیہ یونیورسٹی سے ڈاکٹر محمد اسلم فاروقی کی زیر نگرانی اردو میں پی ایچ ڈی کر رہی ہیں اس کے ساتھ ہی سینٹ جارج کالج آگرہ میں اردو لیکچرر ہیں۔ انھوں نے کہا کہ لڑکیاں اعلیٰ تعلیم حاصل کریں۔ مسابقتی امتحانات میں حصہ لیں اور مختلف ملازمتوں کی اہل بنیں۔ انھوں نے بھی کہا کہ آج سماج میں مسلم لڑکیوں کو اعلیٰ تعلیم کے حصول میں کئی سماجی بندھنوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اس کے باوجود بھی لڑکیاں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ لڑکیوں کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو اخلاق کا پیکر بنائیں۔ تعلیم کے ساتھ ہنر سیکھیں اور اپنی زندگی کو خوشگوار بنائیں۔ ایک لڑکی کی تعلیم ایک خاندان کی تعلیم ہوتی ہے اور ہندوستان میں لڑکیوں کی تعلیم سے انقلاب لایا جاسکتا ہے۔ تعلیم یافتہ لڑکی اسلامی معاشرت سے آراستہ ہو اور وہ جس گھر میں رہے اپنے وجود سے علم و ہنر کا احساس دلائے۔ اس لیکچرر کے اختتام پر این ٹی آر کالج محبوب نگر کی طالبات نے محترمہ سعدیہ سلیم صاحبہ سے سوالات پوچھے۔ محترمہ آمنہ بیگم لیکچرر تاریخ نے شکریہ ادا کیا۔ آگرہ سے آن لائن لیکچر کے اہتمام پر پرنسپل کالج ڈاکٹر بی بی زینب اور دیگر اساتذہ نے ڈاکٹر محمد اسلم فاروقی کو مبارکباد پیش کی۔

آئی ایس سی میں چوتھا مقام حاصل کرنے والی ریچا سنگھ ایک دن کے لیے ڈپٹی کمشنر کی کرسی پر بیٹھی

کلکتہ، 8 مئی، اخبار مشرق: کلکتہ کی ریچا سنگھ کو آئی ایس سی امتحان میں پورے ملک میں چوتھا مقام حاصل ہوا ہے۔ اتفاق سے اس کے والد کلکتہ پولس میں ایڈیشنل او سی ہیں جو گڑیاہاٹ تھانہ میں تعینات ہیں۔ اب ریچا سنگھ کے ساتھ ساتھ اس کے والد کی ہمت افزائی کے لیے کلکتہ پولس نے اس طالبہ کو ایک دن کے لیے ڈی سی ساؤتھ کی کرسی پر بٹھایا۔ یہ کلکتہ پولس کی طرف سے ریچا سنگھ کے لیے ایک انعام یا اعزاز تھا۔ جس کرسی کو والد راکیش کمار سنگھ روزانہ صبح کو سلام کیا کرتے تھے آج اسی کرسی پر ان کی بیٹی بیٹھی۔

کلکتہ پولس کمشنر کی ہدایت پر بنگال کی بیٹی کو ایک دن کے لیے ڈی سی ساؤتھ کے عہدہ پر فائز کیا گیا۔ اس کے والد چونکہ ڈی سی ساؤتھ کے دائرہ کار میں کام کرتے ہیں اس لیے ریچا کے لیے ڈی سی ساؤتھ کی کرسی کا انتخاب کیا گیا۔

سیدھے اسکول سے نکل کر ڈپٹی کمشنر آف پولیس کی کرسی پر بیٹھ کر سیدھی سادی ریچا قدرے نروس دکھا رہی تھی۔ اس سے جب پوچھا گیا تو اس نے کہا کہ کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اسے اتنا بڑا انعام ملے گا۔ جتنی خوشی اسے اس وقت محسوس ہو رہی ہے اتنے ہی اس کے والد بھی خوش ہیں۔ یہ ان کے لیے بھی باعث فخر بات تھی کہ ان کی بیٹی کو کلکتہ پولس کی طرف سے اتنا بڑا انعام ملا۔ بعد میں ریچا کو لال بازار پولس ہیڈ کوارٹر میں بھی پولس کی طرف سے استقبالیہ دیا گیا۔

ایک دن کی ڈپٹی کمشنر کے ساتھ پولس کمشنر نے دن کا کھانا بھی کھایا۔ طالب علموں کی ہمت افزائی کے لیے کلکتہ پولس کے اس اقدام کی نظیر نہیں ملتی۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

عروض آہنگ اور بیان

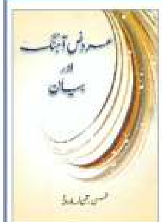

مصنف: شمس الرحمٰن فاروقی

صفحات: 295

قیمت: 137 روپے

آہنگ اور عروض

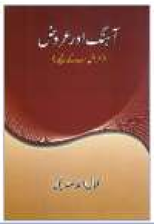

مصنف: کمال احمد صدیقی

صفحات: 357

قیمت: 125 روپے

اردو لسانیات

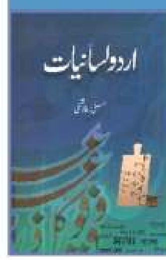

مصنف: علی رفاد فتیحی

صفحات: 252

قیمت: 110 روپے

معالجات (جلد اوّل، دوم، سوم، چہارم)

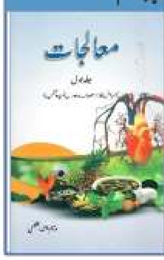

مصنف: وسیم احمد اعظمی

صفحات: 526 (جلد اوّل)، 737 (دوم)

578 (جلد سوم)، 434 (جلد چہارم)

قیمت: 650 روپے (مکمل سیٹ)

اقتصادیات برائے عوام

مصنف: سید اطہر رضا بلگرامی

صفحات: 142

قیمت: 70 روپے

صحت الفاظ

مصنف: سید بدر الحسن

صفحات: 253

قیمت: 83 روپے

تدریس تاریخ

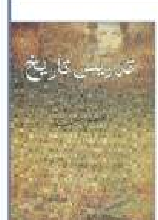

مصنف: خلیل الرب

صفحات: 272

قیمت: 110 روپے

انارکلی

مصنف: سید امتیاز علی تاج

مقدمہ: محمد شاہد حسین

صفحات: 143

قیمت: 90 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Mahnama Khawateen Duniya Monthly June 2019, Vol. 03, Issue: 06 RNI. No. DELURD/2017/74026
National Council for Promotion of Urdu Language ISSN 2581-4826
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025